

پاکستان مجھ سے محبت کرتی ہے

سعدیہ عابد
ڈاٹ کام

www.paksociety.com

سعدیہ عابد

مکمل ناول

فہرین جہاں رحمتی

زندگی!
اپنی آسائشوں کے لیے

بہر خیرات حرف دعا ایک دن
مجھ کو دست بردہ اٹھانا سکھا

یاد آتی ہوئی درد کی کروٹیں
بھول جانا سکھا
عمر گزری ہے دکھتی ہوئی آنکھ میں
چھپتے اشکوں کی کرنیں جاتے ہوئے
زندگی!

بن پڑے تو مجھے ایک پل
مسکراتا سکھا!

نجمہ آنکھوں میں آئی نمی کے سائے میں دھندلائی
صحوں سے اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ رہی تھی
ما کی زبان جو کبھی ماضی میں پھول برسایا کرتی تھی

اس وقت محض زہرا گلنے پر قادر تھی۔
”جاہل عورت“ گھر آئے مہمانوں سے اس طرح
بات کی جاتی ہے جیسے تم کر رہی تھیں؟ ساری زندگی گزر
گئی، جوانی سے بڑھاپا آگیا مگر تمہیں بات کرنے کا
سلیقہ نہ آیا۔ وہ خونخوار نگاہوں سے نجمہ کو گھور رہے تھے
اور وہ بمشکل بولی تھی۔

”نمیل! میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا؟ لڑکے کی
ماں ابھی سے اتنی فرمائش کر رہی تھی اور ہم نے رشتہ پکا
کر دیا تو اور جانے کتنی لمبی لسٹ ہمیں تھما دی گی اور ہم
اپنی معصوم بچی لالچی لوگوں میں تو نہیں بیاہ.....“



”بس بس رہنے دو نجمہ! جانتا ہوں تم اور تمہاری بیٹیاں کتنی محسوس ہیں تمہیں تو ایک اپنے سوا ساری دنیا ہی لاپچی اور جانے کیا کیا لگتی ہے مگر کان کھول کر سن لو آج تو تمہاری بکواس کرنے پر لڑکے والے چلے گئے مگر میں یہ تماشا روز روز برداشت نہیں کروں گا جتنی جلد ہو تیوں کو چلتا کرو اور جہاں تک دینے دلانے کی بات ہے تمہیں بلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جیسے انہیں کھلا پلا کر بڑا کیا ہے کچھ نہ کچھ دے دلا کر رخصت بھی کر دوں گا اب ایسا بھی بھکاری نہیں ہوں۔“ وہ بڑی طرح گرج رہے تھے اور وہ تینوں محض ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئی تھیں رافعہ کے تو آنسو ہی نہ دک رہے تھے اسے اس سب کی ذمہ دار اپنی ذات لگ رہی تھی لڑکے والے آئے بھی تو اسے ہی دیکھتے تھے اور ان کے جانے کے بعد ہی یہ عتاب نازل ہوا تھا جس کی لگائی آگ کے سبب آیا تھا وہ مزے سے صوفے پر بیٹھیں پانی چارے تھیں اور اس سب میں حصہ ڈالنا اپنا فرض سمجھتی تھیں اسی لیے بول پڑی تھیں۔

”تم کون سے خوابوں کی دنیا بسائے بیٹھی ہو بہو! تمہاری چھتوں کے لیے آسمان سے شہزادے نہ اتریں گے اور اس زمانے میں تین تین لڑکیوں کو جیڑ دے کر رخصت کرنا کون سا آسان مرحلہ ہے تمہیں تو پیدا کرنے کا شوق تھا ساری فکریں اور پریشانیاں تو میرے بیٹے کے سر پر سوار رہیں وارث تو تم دے نہ سکیں کم از کم اس بوجھ کو تو سکون سے سر سے اتر جانے دو اپنی نحوست کے سائے یہاں بھی بچھانے پرتی ہوئی ہو۔“ نصیبہ بانو تھارت سے بول رہی تھیں اور نیل گیلانی تن فن کرتے اپنے روم میں چلے گئے تھے اور وہ محض ساس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

”امو جان! بڑی بیٹی رافعہ کی آواز پر جلدی سے

آنسو پونچھے تھے اور ان کے چہرے پر ہمیشہ رہنے والی مسکراہٹ نے فوراً جگہ بنالی مگر چہرے پر اب بھی دکھ کی ہلکی سی چھائی موجود تھی۔

”امو جان! دکھی نہ ہوں یہ تو پیا جانی کی عادت ہے۔“

”تم کس کو تسلی دے رہی ہو؟ ان کو بھی یہ سب سننے اور سہنے کی بہت پرانی عادت ہے۔“ تسبیحہ اندر آتے ہوئے اپنے مخصوص رخ لہجے میں بولی تھی۔

”یہاں تم بات تک کرنے کی تمیز بھولتی جا رہی ہو۔“ رافعہ نے ڈیٹا تھا اور وہ تھی سے مسکرا دی تھی۔

”یہاں کسی کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے ایک میرا ہی شمار کیوں ہونے لگا ہمارے گریٹ پیا جانی کو اس لسٹ میں ٹاپ پر رکھ لو اور پھر دادی اماں مجھ بے چاری کا تو تیسرا نمبر ہے۔“

”یہاں ہر وقت بے ٹکانہ بولا کر ڈ جاؤ اپنے کمرے میں۔“ رافعہ کے کہنے پر وہ اٹھنے کی بجائے ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی تھی نجمہ گیلانی نے اسے بغور دیکھا تھا اٹھان اور خوبصورتی میں ان کا عکس تھا تو

نیل نقش اور باتوں میں تلخی کا عنصر نیل گیلانی سے چرائے گئے تھے ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ رافعہ سب سے بڑی تھی جس نے ایک سال قبل گریجویشن کیا تھا تسبیحہ بی اے پارٹ ٹو میں اور رابعہ انٹر میں تھی نیل گیلانی سخت مزاج تھے گھر میں ان کا اور ان کی ماں کا حکم چلتا تھا رافعہ ماں کی طرح صابر طبیعت جبکہ رابعہ بے فکر شوخ (جیسی وہ خود کسی زمانے میں ہوا کرتی تھیں) اور تسبیحہ کو اپنے گھر کے ماحول اور

ماں باپ سے بہت شکایتیں تھیں جس کے اظہار کا کبھی موقع نہیں ملا تھا اسی لیے وہ دن بدن خود سر اور ضدی کے ساتھ بدتمیز بھی ہوتی جا رہی تھی اور اسے دیکھ کر نجمہ کو نیل گیلانی کے عکس کا ہی خیال آتا تھا اور اسی سبب وہ اسے ڈانٹ بھی نہ پاتی تھیں جبکہ باقی دونوں بیٹیاں انہیں ایسا موقع ہی نہ دیتی تھیں کہ وہ

ان پر غصہ کریں۔

☆☆☆

”امو جان! تھوڑی دیر کی بات ہے میں کتاب لے کر واپس آ جاؤں گی۔“ اس نے ماں کی منت کی تھی۔

”یہاں اپنے پیا جانی سے تو تم واقف ہی ہو دوستوں کے گھر آنے جانے کے سخت خلاف ہیں انہیں پتہ لگے گا تو گھر سر پر اٹھالیں گے۔“ انہوں نے متوقع ڈانٹ کے ڈر سے صاف انکار کر دیا تھا۔

”پیا جانی کی تو آپ رہنے ہی دیں وہ کون سے وقت غصہ میں نہیں ہوتے۔“ وہ تلخ ہوئی تھی جبکہ وہ اسے ناگواری سے دیکھنے لگی تھیں۔

”آپ بتائیں میں کیا کروں کل میرا نیٹ ہے اور کتاب سارہ کے پاس رہ گئی فون بھی ڈیڈ ہے ورنہ وہ خود مجھے آ کر دے جاتی۔“ وہ بحث سے اب چڑنے لگی تھی۔

”اسے نہیں معلوم کہ تمہاری کتاب اس کے پاس ہے وہ خود ہی آ کر دے جائے۔“ وہ بحث کرنے پر مجبور تھیں جبکہ وہ اب رونے لگی تھی۔

”ابھی جا کر کچھ اور پڑھ لو تمہارے پیا آئیں تو انہیں بھیج کر کتاب منگوادوں گی۔“ وہ بیٹی کے آنسوؤں سے کچھ نرم پڑ گئی تھیں۔

”پیا جانی غصے سے میرا گلا تو دبائے ہیں مگر میری دوست کے گھر نہیں جاسکتے۔“ وہ تھی سے ماں سے کہنے لگی تھی اور وہ نظر پڑا گئی تھیں۔

”اچھا ٹھیک ہے جاؤ لیکن اپنے پیا کے آنے سے پہلے آ جانا۔“ وہ اجازت دیتے ہوئے خدشات کا شکار تھیں جبکہ وہ فوراً اپنے کمرے میں گئی تھی اور پرس اٹھا کر چادر اوڑھ کر انہیں اللہ حافظ کہتی جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

”یہاں تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تمہیں اپنے گھر میں

دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔“ سارہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”تم بہت بدتمیز ہو سارہ! یہ تو نہ ہوا کہ میری بک آ کر دے جاتیں! امو جان نے کتنی مشکل سے اجازت دی ہے۔“ وہ اس پر خفا ہوئی تھی۔

”مجھے معلوم تھا مس تسبیحہ گیلانی اپنی کتاب کی کشش میں کتنی چلی آئیں گی۔“ وہ مسکراتی تھی اور اس نے غصے میں کشن اٹھا کر سارہ کو مارا تھا جو اس کے جھک جانے کی وجہ سے اندر آتے وقیع الحسن کی ناک سے ٹکراتا زمین بوس ہو گیا تھا تسبیحہ تو از حد شرمندگی سے ایکدم کھڑی ہو گئی تھی۔

”وہ سوری..... میں تو سارہ.....“ وہ صفائی دینا چاہتی تھی مگر اس سے قبل ہی سارہ بول پڑی تھی۔

”بھیا جانی! یہ میری بیسٹ فرینڈ تسبیحہ ہے۔“ اس نے بیا پر نگاہ ڈالی تھی سیاہ چادر کے ہالے میں خوبصورت گلابی چہرہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں گھبراہٹ گھبراہٹ سی وہ اس لمحے وقیع الحسن پر خاصا گہرا تاثر چھوڑنے کا سبب بنی تھی۔

”تمہارے بناء بتائے بھی پتہ چل گیا تھا کہ یہی مس بیا ہے جن کا ذکر صبح و شام کیا جاتا ہے۔“ اس نے چونک کر دیکھا تھا اور اسے مسکراتے دیکھ کر ایک ناگواری کی سی کیفیت اس کے چہرے پر چھا گئی تھی اسے ایک اجنبی کے منہ سے اپنا تک نیم سننا بالکل اچھا نہیں لگا تھا سارہ نے اسے ڈراپ کرنے کو کہا تھا مگر وہ سہولت سے انکار کرتی باہر نکل گئی تھی اور وہ سر جھٹکتا اپنے روم میں چلا گیا تھا۔

☆☆☆

”اندرا نے کو نہیں کہو گی بیا؟“ وہ نہایت اپنائیت سے پوچھ رہا تھا جبکہ اس کا منہ بن چکا تھا۔

”میرے کون سا منع کر دینے سے تم نے چلے جانا ہے۔“ وہ روزانہ چھوڑ کر اندر کی جانب بڑھی تھی۔

”میری شکل اب اتنی بھی بُری نہیں ہے اچھا خاصا

خوش شکل اور ہنڈ سم ہوں مگر پھر بھی مجھے دیکھ کر تمہارے منہ کے زاویے بگڑ جاتے ہیں اور یقیناً مانو تمہارا یہ روپ بھی مجھے دل سے پسند ہے۔“ وہ جلدی سے اس کے سامنے آیا تھا۔

”زہیر! اپنی حد میں رہا کرو اور اپنی بکواس اپنے تک ہی محدود رکھو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔ ایسا نہ ہو اس گھر میں آنے جانے پر پابندی لگ جائے۔“

”ہا ہا ہا..... واٹ آ گڈ جوک۔“ وہ اسے دیکھنے لگی تھی۔

”بیا! تم مجھے اس گھر میں آنے سے روکو گی تو یہ تمہاری محض خام خیالی ہے تمہارے پیا جانی کا تم سے زیادہ لاڈلا ہوں اور میرے آگے تمہاری حیثیت ہی کیا ہے سوئی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اس کے گلانی گال کو چھوا تھا اور وہ ناگواری سے پیچھے ہٹی تھی کوئی سخت بات کہتی کہ سامنے سے آئی دادی کو دیکھ کر محض اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

”تم اس طرح سے دیکھتی ہو نا تو قسم سے دل کی دھڑکن بند ہوتی محسوس ہوتی ہے۔“ وہ سرگوشی میں کہتا نانی کی جانب بڑھ گیا تھا۔

”السلام علیکم نانو! کیسی ہیں آپ؟“ وہ ادب سے ان کے سامنے جھکا تھا اور وہ نواسے کی اس ادا پر نہال ہوتیں سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دینے لگی تھیں۔

”باقی خواتین کہاں ہیں؟ کوئی نظر نہیں آ رہا۔“ وہ جاتی ہوئی تسبیح کو دیکھتا نانی سے پوچھ رہا تھا۔

”کوئی شاپنگ پر اور کوئی پڑھنے کے نام پر تفریح کے لیے گیا ہے۔“ وہ بیا کو دیکھ کر طنز سے بولی تھیں۔

”بیا! تم نے آج چھٹی کیسے کر لی؟ جناح صاحب تو ناراض ہو گئے ہوں گے۔“ وہ اسے بولنے پر اکسار رہا تھا جبکہ وہ اسے گھورنے لگی تھی۔

”میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ ان لڑکیوں کو باہر مت

بھیجؤ چلا لیا نہ چکر۔“

”نانو! آپ بھی بات کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں میرا اشارہ بیا کی جامعہ کی طرف تھا۔“ اس نے تسبیح کے چہرے پر غصے کی لالی دیکھ کر وضاحت کی تھی۔

”تم کہاں چلیں جا کر زہیر کے لیے چائے بناؤ۔“ انہوں نے اسے حکم دیا تھا۔

”میں کسی کی نوکر نہیں ہوں وہ سامنے بچن ہے جسے جو کچھ کھانا پینا ہے خود جا کر بنائے اور کھائے۔“ وہ کہہ کر رُکی نہیں تھی۔

”دیکھا تو نے کیسی قہقہی کی طرح چلتی ہے اس بد تمیز اور اول نمبر کی پھوہڑ لڑکی کی زبان کسی کا جو اسے لحاظ ہو۔“ وہ بیا کی شان میں کلمات کہہ رہی تھیں جیسی سامان سے لدی پھندی نجمہ اور رافدہ آگئیں تھیں۔

”السلام علیکم ماما جان! کیا کچھ خرید لائیں۔“ وہ خلوص سے پوچھ رہا تھا اور اس کا یہ خلوص و ادب نفیسہ بیگم کو ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔

”زیادہ کچھ نہیں بیٹا! سودا سلف لینے چلے گئے تھے۔“ وہ اپنی چادر کے کونے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے اسے بتا رہی تھیں۔

”سیر سپالے ختم ہو گئے ہوں تو بچے کو چائے پانی کو ہی پوچھ لو کب سے آیا بیٹھا ہے تمہاری وہ خود سولاد بد لٹاٹی سے ٹکا سا جواب دے کر حجرہ نشین ہو گئی میں بتائے دیتی ہوں بہو! تمہاری دوسرے نمبر والی بیٹی کے چھن کچھ ٹھیک نہیں ہیں سر پکڑ کر رونے سے پہلے ہی اسے لگام ڈال لو۔“ وہ شروع ہوئیں تو چپ کرانا مشکل ہو گیا رافدہ چائے بنانے مگن میں چلی گئی تھی اور وہ بیا کو آوازیں دینے لگی تھیں۔

نفیسہ بیگم کی دو اولادیں تھیں رضیہ بڑی تھی اور اس کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ جمشید سب سے بڑا تھا اور دماغی لحاظ سے وہ کمزور تھا 26 برس کی عمر میں اس کا دماغ 13-12 سال کے بچے کا سا

تھا کیونکہ وہ جب 12 سال کا تھا میٹر ہیوں سے گر گیا تھا اور وہ ذہنی لحاظ سے وہیں ٹھہر گیا تھا جمشید کے بعد زہیر تھا جس نے اکاؤنٹس میں ماسٹر کیا تھا اور ایک پرائیویٹ بینک میں اکاؤنٹنٹ تھا تیسرے نمبر پر سمید تھا جو بی کام پارٹ نو میں جامعہ کراچی کا اسٹوڈنٹ تھا سب سے چھوٹی سمیہ کا اپنے ماموں کی فیملی سے ناں اور نانی کے برعکس اچھا رویہ تھا جبکہ سمید اپنی ہی زندگی میں مگن رہنے والا خاموش طبیعت انسان تھا وہ بہت ہی کم ”گیلائی ہاؤس“ آتا تھا۔ نیل گیلانی کی اولاد زینہ نہ تھی صرف 3 بیٹیاں تھیں وہ اپنی ماں اور بہن سے زیادہ محبت کرتے تھے جبکہ صفیہ کے شوہر احمد کشم میں ملازم تھے اور نیل گیلانی اکاؤنٹنٹ تھے۔

☆☆☆

”بیا! ہمارا کالج پکنک پر جا رہا ہے۔“ راعیہ کے دھم سے بیٹھنے پر اس نے ناگواری سے دیکھا تھا۔

”کالج نہیں کالج میں پڑھنے والے اسٹوڈنٹ اور نیچر ز پکنک پر جاتے ہیں۔“ تسبیح نے بکھرے ہوئے صفحات فائل میں لگاتے ہوئے صحیح کی تھی۔

میرا مقصد بھی یہی تھا بیا! بہت مزا آئے گا۔“ بُرا منائے بغیر وہ جوش سے بولی تھی۔

”مزاجب آئے گا جب تم جاؤ گی۔“

”پیا جانی ایسے فضول کاموں کا سن کر ہی غصہ میں آ جاتے ہیں۔“ وہ اب جلدی جلدی اسائنمنٹ میں ہیڈنگز ال رہی تھی۔

”پیا جانی آئیں گے تو میں ان سے بات کر لوں گی وہ منع نہیں کریں گے۔“ اس نے یقین سے کہا تھا۔

”اتنی بھی خوش فہمیاں اچھی نہیں ہوتیں۔“

”اتنی بد گمانیاں بھی اچھی نہیں ہوتیں ہمارے پیا اب اتنے بھی بُرے نہیں ہیں جتنا آپ لپ انہیں سمجھتی ہیں۔“ وہ کچھ خفا ہوئی تھی۔

”وہ ہم سے بہت پیار کرتے ہیں۔“

”یہ تمہاری بھول ہے کہ مسٹر نیل گیلانی کو اپنی بیوی اور بیٹیوں سے محبت ہے وہ صرف اپنی انا و ضد کے علاوہ کسی سے محبت کرتے ہیں تو وہ ان کی ماں ہیں اور ان کے بچے ہیں۔“ وہ نجی سے بہن کی بات کاٹ کر طنز یہ انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

”بیا! آپ ذرا سی بات کو جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں اور آپ ہر وقت پیا جانی کو بُرا کہتی رہتی ہیں مگر ہیں آپ بھی بالکل ان کے جیسی صرف اپنے جذبات کا خیال رکھ کر سامنے والے کو کچھ بھی کہہ دیتی ہیں۔“ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں تھیں اور وہ شرمندہ ہو گئی تھی۔

راعیہ کے جاتے ہی اس نے اپنے فائل کیے اسائنمنٹ کو نیل پر رکھا تھا اور مغرب کی نماز ادا کر کے روم سے باہر آ گئی تھی لاؤنج سے گزرتے ہوئے باپ پر نگاہ پڑی تھی تو ان کو سلام کرتی کچن میں آ گئی تھی۔ کیوں میں چائے انڈیل کر اس نے راعیہ کو آواز لگائی تھی نجمہ گیلانی نے اس کی یہ ساری کارروائی سالن چڑھاتے ہوئے خاموشی سے دیکھی تھی راعیہ فوراً ہی چلی آئی تھی۔

”پیا جانی کا موڈ دیکھ کر بات کرنا اور خیال رکھنا دادی ماں نہ ہوں۔“ اس نے راعیہ کو ٹرے دیتے ہوئے ہدایت دی تھی اور راعیہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی تھی جانتی تھی اپنی بہن کو باہر سے سخت نظر آنے والی بہت نرم دل کی مالک تھی۔ راعیہ نے ڈرتے ڈرتے لاؤنج میں قدم رکھا تھا۔

”چائے بہت اچھی بنا کی ہے۔“ وہ دھیمے سے مسکرائے تھے اسے حیرت تو ہوئی تھی مگر ان کے خوشگواری سے کہنے پر اس کی ہمت بندھ گئی تھی۔

”پیا جانی! ہمارے کالج والے پکنک پر جا رہے ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی چلی۔“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ انہوں نے 1000 کا نوٹ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”بیا! مجھے تو اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ بتا نہیں سکتی“
چپا جانی نے کچھ بھی کہے بیا اجازت دے دی اور
اتنے سارے پیسے بھی۔“ بیا نے بہن کا چہکتا ہوا
انداز دیکھا تھا۔

”یہ اجازت تمہیں نہیں سمیہ کو ملی ہے ان کی بہن
نے کہا تھا کہ وہ تمہیں جانے دیں صرف اس لیے انہوں
نے تمہیں اجازت دے دی۔“ اس نے دل میں سوچا تھا
اور راحیہ کے خوشی سے سرشار انداز اسے کچھ بھی کہنے
سے روک گیا تھا۔

☆☆☆

”مامی جان! چائے تو میں صرف بیا کے ہاتھ کی
پیوں گا۔“ اس نے بیا پر ایک نگاہ ڈالی تھی جس کے منہ
کے زاوے بگڑ گئے تھے۔
”میں کسی کی ملازمت نہیں ہوں۔“

”بیا! کچن میں جا کر چائے بناؤ۔“ انہوں نے
اسے گھورا تھا۔

”ہائے بیا! قسم سے تمہیں اس طرح اپنے لیے
چائے بناتے دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے بتا نہیں سکتا۔“
نسیجہ نے آواز پر جلدی سے آنسو صاف کیے تھے۔

”جب تم ہر بار مجھ سے ہار جاتی ہو تو کیوں بحث و
مباحثہ کر کے اپنی بے عزتی کرواتی ہو پہلے ہی چائے
بنانے آ جاتیں۔“ وہ اسے کہوں میں چائے اٹھ پلٹے
دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔

”چائے یہیں رکھ دوں یا لاؤنج میں لے
جاؤں؟“ اسے دیکھے بناء سوال کیا تھا۔

”اپنے ہاتھوں سے پلاؤ گی تو یہیں پی لوں گا۔“
وہ معنی خیزی سے کہتا اس کا ضبط آزما گیا تھا۔

”میرا بس چلے ناں تو تمہیں زہر دے دوں۔“ وہ
ٹرے پٹخ کر باہر نکلی تھی مگر اس کی کلائی زہیر کے ہاتھ
میں آ گئی تھی۔

”اپنی حد میں رہو زہیر۔“ وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے
درجنکی سے بولی تھی۔

”میں تو اپنی حد میں ہی ہوں تم ہی اپنی حد میں
کر اس کرنے پر تکی ہو میں تمہاری سب باتیں سمیہ لیتا
ہوں تو تم میرے سر پر چڑھنے لگی ہو لگتا ہے اماں کو
ماسوں جان کے پاس بھیجتا ہی پڑے گا۔“ وہ آخر میں
شوخی ہوا تھا۔

”تم کیا اپنی اماں کو بھیجو گے وہ خود ہی ہر تیسرے
دن یہاں موجود ہوتی ہیں۔“ وہ بھڑکی تھی۔

”تم میرا مطلب نہیں سمجھیں اماں کو تمہارا ہاتھ
مانگئے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے تمہاری شکل تک
سے نفرت ہے۔“ وہ نہایت غصے سے بول رہی تھی۔

”مجھے تمہاری نفرت سے سروکار نہیں ہے شادی
کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔“ وہ
بہت مضبوط لہجے میں بولا تھا۔

”مسٹر زہیر! اس دنیا میں سب سے زیادہ نفرت
مجھے تم سے تمہاری ماں اور نانی سے ہے اس لئے بھول
کر بھی اپنی ماں کو میرا رشتہ لے کر نہ بھیجتا خوا خواہ میں
میرے انکار کی صورت میں تمہاری ماں کی بے عزتی ہو
گی اور ایسا تم یقیناً نہیں چاہو گے۔“ اس کے لہجے میں
اُن لوگوں کے لیے زہر گھلا ہوا تھا۔

”انکار..... اور وہ بھی تم کرو گی۔“ اسے اچنبھا سا
ہوا تھا۔

”شادی تو تمہاری مجھ ہی سے ہو گی ماسوں جان!
نانو کی کوئی بات نہیں ٹالتے ویسے بھی تم سے پوچھے گا
کون؟ انہوں نے کب تم سے الفت جتائی ہے جو
تمہارے اقرار یا انکار کی پرواہ کریں گے سب سے
زیادہ نفرت تو وہ تم ہی سے کرتے ہیں۔“ وہ اسے آسمان
سے یکدم زمین پر پٹخ گیا تھا۔

”ان آنسوؤں کو اپنی رخصتی کے لیے بچا رکھو۔“
وہ اس کی آنکھ سے نکلے آنسو پور پر سیٹھا باہر کی
جانب بڑھا تھا۔

”شادی تو تمہاری مجھ ہی سے ہو گی ماسوں جان!
نانو کی کوئی بات نہیں ٹالتے ویسے بھی تم سے پوچھے گا
کون؟ انہوں نے کب تم سے الفت جتائی ہے جو
تمہارے اقرار یا انکار کی پرواہ کریں گے سب سے
زیادہ نفرت تو وہ تم ہی سے کرتے ہیں۔“ وہ اسے آسمان
سے یکدم زمین پر پٹخ گیا تھا۔

”ان آنسوؤں کو اپنی رخصتی کے لیے بچا رکھو۔“
وہ اس کی آنکھ سے نکلے آنسو پور پر سیٹھا باہر کی
جانب بڑھا تھا۔

”ان آنسوؤں کو اپنی رخصتی کے لیے بچا رکھو۔“
وہ اس کی آنکھ سے نکلے آنسو پور پر سیٹھا باہر کی
جانب بڑھا تھا۔

”ان آنسوؤں کو اپنی رخصتی کے لیے بچا رکھو۔“
وہ اس کی آنکھ سے نکلے آنسو پور پر سیٹھا باہر کی
جانب بڑھا تھا۔

”ان آنسوؤں کو اپنی رخصتی کے لیے بچا رکھو۔“
وہ اس کی آنکھ سے نکلے آنسو پور پر سیٹھا باہر کی
جانب بڑھا تھا۔

☆☆☆

”بھئی میں پوچھتی ہوں یہ لڑکیاں اسکول کالج
پڑھنے جاتی ہیں یا دوستیاں بنانے؟“ کچھ دیر پہلے
اس سارہ اپنی برتھ ڈے پارٹی میں نسیجہ کو انوائٹ
کرنے آئی تھی اور جس کے جاتے ہی نسیجہ بیگم شروع
ہو گئی تھیں۔

”اماں! کبھی تو بولنے سے پہلے سوچا کریں میری
بچیاں آپ کی بھی کچھ تو لگتی ہیں۔“ نسیجہ بیگم ششدر سی
اُنہیں دیکھ رہی تھیں کیونکہ وہ کچھ بھی کیوں نہ بولتی رہیں
نجمہ آگے سے انہیں کچھ بھی نہیں کہتی تھیں۔

”نجمہ! میں نے کب تمہیں یا بچیوں کو کچھ کہا ہے
یہ بچیاں میرا خون ہیں میں انہیں بڑے بھلے کا نہیں
بتاؤں گی تو پھر کون بتائے گا؟ مگر تمہیں بڑا لگتا ہے تو
آئندہ کچھ نہیں بولوں گی۔“ وہ سب کی سب حیرانگی
سے انہیں پینتر ابد لے دیکھ رہی تھیں مگر اندر آتے
نیل گیلانی کو دیکھ کر وہ ان کا مقصد سمجھ گئی تھیں جبکہ وہ
ملل کے سفید دوپٹہ میں جھوٹ موٹ کے آنسو جذب
کر رہی تھیں۔

”نجمہ! تم نے اماں جان سے کیا کہا ہے؟“ وہ ان
کے عین سامنے کھڑے جواب طلب کر رہے تھے۔

”نیل! میں نے اماں سے کچھ نہیں کہا یہ خود ہی
راہی بات کو افسانہ بنا رہی ہیں۔“ وہ کچھ نہ کہہ کر بھی
دور بن گئی تھیں۔

”رہنے دے بیلیو! تو غصہ نہ کر“ آفس سے تھکا ہوا
بابا سے جا کر آرام کر لے مجھے تو اب جیسے یہ سب سننے
سنبھلنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔“ وہ آنکھوں میں آنسو
لے ہوئے بولیں۔

”کیسی باتیں کرتی ہیں اماں! آپ اس گھر کی
میں ہیں چار باتیں سنانے کا حق رکھتی ہیں اور نجمہ
تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی میری ماں کی بے عزتی
کرنے کی فوراً ان سے معافی مانگو۔“ ماں کو دلاسا
دینے کے بعد انہوں نے بیوی کو حکم دیا تھا نجمہ نم پلکوں
سے سانس کی جانب بڑھی تھی لیکن نسیجہ نے آگے بڑھ

”نجمہ! میں نے اماں جان سے کیا کہا ہے؟“ وہ ان
کے عین سامنے کھڑے جواب طلب کر رہے تھے۔

”نیل! میں نے اماں سے کچھ نہیں کہا یہ خود ہی
راہی بات کو افسانہ بنا رہی ہیں۔“ وہ کچھ نہ کہہ کر بھی
دور بن گئی تھیں۔

”رہنے دے بیلیو! تو غصہ نہ کر“ آفس سے تھکا ہوا
بابا سے جا کر آرام کر لے مجھے تو اب جیسے یہ سب سننے
سنبھلنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔“ وہ آنکھوں میں آنسو
لے ہوئے بولیں۔

”کیسی باتیں کرتی ہیں اماں! آپ اس گھر کی
میں ہیں چار باتیں سنانے کا حق رکھتی ہیں اور نجمہ
تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی میری ماں کی بے عزتی
کرنے کی فوراً ان سے معافی مانگو۔“ ماں کو دلاسا
دینے کے بعد انہوں نے بیوی کو حکم دیا تھا نجمہ نم پلکوں
سے سانس کی جانب بڑھی تھی لیکن نسیجہ نے آگے بڑھ

”نجمہ! میں نے اماں جان سے کیا کہا ہے؟“ وہ ان
کے عین سامنے کھڑے جواب طلب کر رہے تھے۔

”نیل! میں نے اماں سے کچھ نہیں کہا یہ خود ہی
راہی بات کو افسانہ بنا رہی ہیں۔“ وہ کچھ نہ کہہ کر بھی
دور بن گئی تھیں۔

”رہنے دے بیلیو! تو غصہ نہ کر“ آفس سے تھکا ہوا
بابا سے جا کر آرام کر لے مجھے تو اب جیسے یہ سب سننے
سنبھلنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔“ وہ آنکھوں میں آنسو
لے ہوئے بولیں۔

”کیسی باتیں کرتی ہیں اماں! آپ اس گھر کی
میں ہیں چار باتیں سنانے کا حق رکھتی ہیں اور نجمہ
تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی میری ماں کی بے عزتی
کرنے کی فوراً ان سے معافی مانگو۔“ ماں کو دلاسا
دینے کے بعد انہوں نے بیوی کو حکم دیا تھا نجمہ نم پلکوں
سے سانس کی جانب بڑھی تھی لیکن نسیجہ نے آگے بڑھ

کر ان کا بازو تھام لیا تھا۔
”چپا! غلطی امو جان کی نہیں دادی ماں کی ہے۔“
اس لیے معافی بھی دادی جان کو ہی مانگنی چاہیے۔“
وہ دیدہ دلیری سے سرد لہجے میں بولتی اُن سب کو ہی
حیران کر گئی تھی نیل گیلانی نے اسے دیکھا تھا
سامنے وہ لڑکی کھڑی تھی جسے وہ ہمیشہ سے ہی
ٹھکراتے آئے تھے اور اُن کا غصہ اب آسمان سے
باتیں کرنے لگا تھا۔

”تمہیں تمہاری ماں نے تیز نہیں سکھائی۔“
”اتفاق سے میں اپنے باپ اور دادی پر چلی گئی
ہوں۔“ وہ کئی سے بولی تھی مگر دوسرے ہی لمحے وہ بڑی
حیرانگی سے ماں کو دیکھ رہی تھی اور پھر بھاگتے ہوئے
گال پر ہاتھ رکھے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

”نجمہ! اپنی بیٹی کو تیز سکھاؤ ایسا نہ ہو کسی دن میرے
ہاتھوں ضائع ہو جائے۔“ نیل گیلانی نے بھی اپنے
کمرے کا رخ کیا تھا۔

”اماں! ایسا میں نے کیا کیا ہے جو آپ گزرے
24 سالوں سے مجھ پر زندگی کا دائرہ تنگ پر تنگ کیے جا
رہی ہیں؟“ وہ صوفے پر ڈھسے گئی تھیں۔

”تو نے مجھ سے میرا بیٹا چھینا تھا اور میں نے تجھ
سے تیرا شوہر اور تیری بچیوں سے اُن کا باپ چھین لیا۔“
وہ نفرت سے بولی تھیں۔

”صرف تیری وجہ سے میرا بیٹا میرے سامنے کھڑا
ہو گیا جس نے بھی مجھ سے نظر ملا کر بات نہ کی تھی وہ
میرے خلاف چلا گیا اور تجھے بیاہ کر اس گھر میں لے آیا
اور میں اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان دل
میں ہی لیے بیٹھی رہ گئی مگر جس طرح تو نے میرے
ارمانوں کا خون کیا تھا ویسے میں بھی تجھ سے تیری ایک
ایک خوشی چھین لینا چاہتی ہوں۔“ نسیجہ بیگم ایک نظر نجمہ
کے چہرے پر ڈال کر باہر نکل گئی تھیں۔

”امو جان! دادی ماں کیا کہہ رہی تھیں بتائیے نا
امو جان۔“ راحیہ اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”امو جان! دادی ماں کیا کہہ رہی تھیں بتائیے نا
امو جان۔“ راحیہ اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”امو جان! دادی ماں کیا کہہ رہی تھیں بتائیے نا
امو جان۔“ راحیہ اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”امو جان! دادی ماں کیا کہہ رہی تھیں بتائیے نا
امو جان۔“ راحیہ اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”امو جان! دادی ماں کیا کہہ رہی تھیں بتائیے نا
امو جان۔“ راحیہ اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”امو جان! دادی ماں کیا کہہ رہی تھیں بتائیے نا
امو جان۔“ راحیہ اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”امو جان! دادی ماں کیا کہہ رہی تھیں بتائیے نا
امو جان۔“ راحیہ اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”امو جان! دادی ماں کیا کہہ رہی تھیں بتائیے نا
امو جان۔“ راحیہ اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”امو جان! دادی ماں کیا کہہ رہی تھیں بتائیے نا
امو جان۔“ راحیہ اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”امو جان! دادی ماں کیا کہہ رہی تھیں بتائیے نا
امو جان۔“ راحیہ اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”امو جان! دادی ماں کیا کہہ رہی تھیں بتائیے نا
امو جان۔“ راحیہ اُن سے پوچھ رہی تھی۔

”امو جان! محبت کی شادی کرنا جرم تو نہیں ہے اس کی دادی ماں اتنی بڑی سزا کیسے دے سکتی ہیں اور پیا جانی! ان کا آپ سے رویہ وہ تو نہیں لگتا کہ انہوں نے کبھی آپ سے محبت کی تھی۔“ راعیہ نے رافعہ کے روکنے کے باوجود جوڑہن میں آیا کہہ دیا تھا۔

”میں تم لوگوں کو بتاؤں گی کہ چھوٹا سا جرم گناہ کیسے بنتا ہے اور اس کی کتنی کڑی سزا ملتی ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی تھیں۔

”مگر میں کسی سے شکوہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی کیونکہ جب اختیار تھا تو خود ہی تو اس سزا کو منتخب کیا تھا میرے پاس دور راستے تھے ایک راستہ میری محبت کو پانے کے لیے رہنمائی عطا کرتا تھا تو دوسرا راستہ مجھے محبت سے دور لے جا کر مجھے عزت و مان فراہم کرتا تھا اور میں (خوش فہم) محبت کے راستے پر یہ سوچ کر چل پڑی کہ جو شخص مجھ پر جان چڑھتا ہے وہ مجھے عزت و مان بھی دے گا مگر میں یہ نہیں جانتی تھی کہ عزت و مان تو کیا پاؤں کی اپنی محبت کو بھی کھودوں گی۔“ نجمہ کے لہجے میں ٹوٹے سپنوں کی کرچیاں بول رہی تھیں۔

”نیل سے میری پہلی ملاقات اپنے اکلوتے ماموں کے ہاں ہوئی تھی نیل میرے ماموں زاد ظفیر احسن کے بیٹے فرینڈ تھے میں سیکنڈ ایئر کی شوخ و شنگ اور چلبلی سی اسٹوڈنٹ تھی مجھ سے باتوں میں کبھی کوئی نہیں جیت سکا تھا میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور میری طرح میرے بابا بھی اکلوتے تھے اور اماں کے ایک ہی بھائی منور احسن تھے جن کے ہاں میں بہت جایا کرتی تھی اور نیل اکثر ماموں جان کے ہاں آیا کرتے تھے وہ بالکل ان کے فیملی ممبر کی طرح تھے میری ان سے کبھی براہ راست بات نہیں ہوئی تھی مگر نہ جانے کب وہ مجھے اتنے اچھے لگنے لگے کہ وہ میرے خیاؤں خواہوں میں بس گئے میری شادی بچپن ہی میں

ظفیر احسن سے ملے ہو گئی تھی جس کا مجھے علم ہوا تو مجھے کہیں چین ہی نہیں پڑتا تھا میں نے ظفیر احسن سے شادی سے اماں کو انکار کر دیا تھا مگر انہوں نے میری کوئی بھی بات یا انکار کو خاطر میں لائے بغیر شادی کی تیاریاں شروع کر دیں میری اور نازش (ظفیر احسن کی بہن) کی بہت زیادہ دوستی تھی میں نے نیل کے دل کا حال جانے بغیر ہی نازش کو اپنے دل کا حال سنا کر شادی رکوانے کی بات کی اور میری خوش قسمتی تھی کہ ہماری باتیں ظفیر احسن نے سن لی تھیں مگر میں اس وقت اس بات سے لاعلم تھی ماموں جان کے گھر سے نکل رہی تھی کہ نیل گیلانی وہاں آ گئے انہوں نے مجھے پہلی دفعہ مخاطب کیا تھا۔

”سنا ہے آپ کی شادی ہو رہی ہے؟“ میرا سر اثبات میں ہل گیا تھا اور جانے کے لیے آگے بڑھی تھی کہ پیچھے سے گھمبیر آواز گونجی تھی۔

”نئی! آپ کو کب سے میں دل میں بسائے ہوئے تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ مجھے میری محبت بھی نہ ملے گی کاش کہ آپ میری زندگی میں شامل ہو سکتیں۔“ نیل کا اظہار محبت مجھے یہ بھلا گیا تھا کہ کچھ ہی ماہ بعد میری شادی ہے میں بس اسی لمحے میں جینے لگی تھی جب نیل نے مجھ سے اقرار محبت کیا تھا۔ ظفیر احسن نے ہماری باتیں سنیں اور انہوں نے خود نیل گیلانی کو اپنی ماں کو بھیجنے کے لیے کہا تھا مگر نیل کی والدہ راضی نہیں ہو رہی تھیں مجھے فکر تو ہوتی تھی مگر میں نیل کے دلاسوں کے سہارے جی رہی تھی ہر بار ان سے بات کرنے کے بعد میرے چہرے پر قوس و قزح کے رنگ بکھر سے جاتے تھے میں نے اپنے لیے تو جینا ہی چھوڑ دیا تھا میری والدہ روب میں نیل کے پسندیدہ کمرز کے کپڑے سج گئے تھے یلو کمر میرا فیورٹ تھا مگر نیل کے سرسری سے کہنے پر انہیں یہ رنگ پسند نہیں میں نے یلو کمر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا چھوڑ دیا نیل کو جوڑیاں بہت پسند تھیں میرے ہاتھ میں کالج کھٹکنے لگا

نیل کو لمبے بال پسند تھے اور میں نے بال ترشوانا چھوڑ دیئے نیل کو بے وجہ بولتی اور قہقہے لگاتی لڑکیاں نا پسند تھیں میں نے دھیمے دھیمے بولنا اور اپنے آپ سکرانا سیکھ لیا میں نجمہ اسد کہیں بھی نہ رہی تھی میرے چار سو نیل گیلانی کی محبت کا سایہ ہو گیا تھا۔ نیل کو کھونے سے بڑا ڈر لگتا تھا اور پھر یہی ڈر میری زندگی بن گیا کھونے والی چیز تو بالآخر کھو ہی جاتی ہے بھی پا کر اور بھی پانے سے پہلے۔“ لفظ بھر کو وہ خاموش ہو میں تھیں کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا۔

”میں نیل کو کھونے سے ڈرتی تھی اور وہ مجھے پانے کے خواہشمند تھے اپنی ماں کو منانے میں ناکام ہو کر انہوں نے کورٹ میرج کی مجھے راہ دکھائی میرے انکار پر وہ ناراض ہو گئے 3 دن مجھ سے بات نہ کی اور میں ان کی بے رخی برداشت نہ کر سکی اور اسپتال پہنچ گئی زندگی اور موت کی کشمکش میں 2 دن گزار کے میں گھر لوٹ آئی اور میرے پیرنس اور ماموں جان وغیرہ نے میرا نکاح نیل سے پڑھوا دیا اور جب نیل مجھے اماں کے پاس لائے تو انہوں نے مجھے ٹھکرا دیا اور نیل ماں کے قدموں میں بیٹھ گئے اور اماں نے ترس کھا کر مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا نیل تو ماں کے کہنے پر ہی چلتے تھے جبکہ اماں نے پہلے ہی دن سے مجھ سے پیرسا باندھ لیا تھا وہ اور رضیہ باجی نیل کے سامنے مجھے کچھ نہ کہتیں مگر ان کے پیچھے پیچھے وہ کون سا زخم ہے جو انہوں نے مجھے نہ لگایا۔ مجھے میکے جانے کی اجازت نہ تھی نیل کا کہنا تھا جب ان کی ماں کا غصہ ٹھنڈا ہو گا میں میکے جانے لگوں گی میرے بابا بیمار تھے جب بھی میں ان سے ملنے نہ جاسکی اور جب ان کی ڈیڑھ کی خبر ملی تو نیل شہر سے باہر تھے میں نے اماں کے سامنے ہاتھ جوڑے ان کے پیر پڑی مگر انہوں نے باپ کا آخری دیدار اور شوہر کے ساتھ میں سے کسی ایک کو ملنے کے لیے کہا میں ان کی سنگدلی پر تڑپ اٹھی مگر

مشرقی عورت شوہر کی دلیر عبور نہ کر سکی اپنا گھر بچانے کے لیے باپ کا دیدار نہ کیا مگر مری پھر بھی میں ہی بنی۔ نیل کے آنے پر اماں نے ان سے جانے کیا کہا کہ وہ میری ماں کے بھی خلاف ہو گئے اور میں اس آدمی ادھوری ملاقات سے بھی گئی کیونکہ کبھی کبھار نیل میری ان سے فون پر بات کروا دیتے تھے۔ زندگی کی کٹھنائیوں میں نئے مہمان کی آمد نے مجھے ایک بار پھر سے زندہ کر دیا اماں اٹھتے بیٹھتے پوتے کی خواہش کا اظہار کرتیں مگر نیل بالکل خاموش تھے اور باپ بننے کی خوشی ان کے چہرے سے جھلکتی تھی اور جب میں نے ایک بیٹی کو جنم دیا تو اماں اُسے دیکھ بٹا ہی اسپتال سے چلی گئیں اور میں بہت زیادہ خوفزدہ تھی مگر جس وقت نیل نے بیٹی کو گود میں اٹھا کر اس کی پیشانی چومی اور اسے رافعہ نام دیا تو میرے سارے خوف زائل ہو گئے مگر یہ میری خام خیالی تھی بعد میں کبھی انہوں نے رافعہ کو گود میں نہیں اٹھایا اور جب اللہ نے مجھے ایک بار پھر خوشی سے نوازا اور اماں کی وہی رٹ کہ انہیں پوتا چاہیے اور اس دفعہ تو نیل نے بھی صاف بیٹے کے لیے کہہ دیا تھا میں بہت حسرت سے نیل کو دیکھا کرتی تھی مگر میں اپنی بیٹی اور آنے والے بچے کے لیے زندہ رہنے پر مجبور تھی ان ہی دنوں میں مجھے اماں جان کی خراب طبیعت کی اطلاع ملی میں اپنی ماں کے پاس جانا چاہتی تھی مگر اماں کی بے حس طبیعت نے مجھے اپنی ماں سے ملنے نہ دیا مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔“ نجمہ کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

”شاید۔۔۔ رب کو میری حالت پر رحم آ گیا تھا“ میں جو باپ کے آخری دیدار سے محروم ہو گئی تھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی ایسی راہ نکالی کہ میں اپنی ماں سے ملنے میں کامیاب ہو گئی میں نیل کے ساتھ منتقلی چیک اپ کے لیے گئی تھی وہیں مجھے ماموں جان نظر آ گئے اور میں ان کی مدد سے اپنی ماں سے ملنے میں کامیاب ہو گئی میں اپنی ماں سے پورے 3 سال بعد ملی تھی اور

”امو جان! محبت کی شادی کرنا جرم تو نہیں ہے اس کی دادی ماں اتنی بڑی سزا کیسے دے سکتی ہیں اور پیا جانی ان کا آپ سے رویہ وہ تو نہیں لگتا کہ انہوں نے کبھی آپ سے محبت کی تھی۔“ راعیہ نے رافعہ کے روکنے کے باوجود جوڑہن میں آیا کہہ دیا تھا۔

”میں تم لوگوں کو بتاؤں گی کہ چھوٹا سا جرم گناہ کیسے بنتا ہے اور اس کی کتنی کڑی سزا ملتی ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی تھیں۔

”مگر میں کسی سے شکوہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی کیونکہ جب اختیار تھا تو خود ہی تو اس سزا کو منتخب کیا تھا میرے پاس دور راستے تھے ایک راستہ میری محبت کو پانے کے لیے رہنمائی عطا کرتا تھا تو دوسرا راستہ مجھے محبت سے دور لے جا کر مجھے عزت و مان فراہم کرتا تھا اور میں (خوش فہم) محبت کے راستے پر یہ سوچ کر چل پڑی کہ جو شخص مجھ پر جان چڑھتا ہے وہ مجھے عزت و مان بھی دے گا مگر میں یہ نہیں جانتی تھی کہ عزت و مان تو کیا پاؤں کی اپنی محبت کو بھی کھودوں گی۔“ نجمہ کے لہجے میں ٹوٹے سپنوں کی کرچیاں بول رہی تھیں۔

”نیل سے میری پہلی ملاقات اپنے اکلوتے ماموں کے ہاں ہوئی تھی نیل میرے ماموں زاد ظفیر احسن کے بیٹے فرینڈ تھے میں سیکنڈ ایئر کی شوخ و شنگ اور چلبلی سی اسٹوڈنٹ تھی مجھ سے باتوں میں کبھی کوئی نہیں جیت سکا تھا میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور میری طرح میرے بابا بھی اکلوتے تھے اور اماں کے ایک ہی بھائی منور احسن تھے جن کے ہاں میں بہت جایا کرتی تھی اور نیل اکثر ماموں جان کے ہاں آیا کرتے تھے وہ بالکل ان کے فیملی ممبر کی طرح تھے میری ان سے کبھی براہ راست بات نہیں ہوئی تھی مگر نہ جانے کب وہ مجھے اتنے اچھے لگنے لگے کہ وہ میرے خیالوں خواہوں میں بس گئے میری شادی بچپن ہی میں

ظفیر احسن سے ملے ہو گئی تھی جس کا مجھے علم ہوا تو مجھے کہیں چین ہی نہیں پڑتا تھا میں نے ظفیر احسن سے شادی سے اماں کو انکار کر دیا تھا مگر انہوں نے میری کوئی بھی بات یا انکار کو خاطر میں لائے بغیر شادی کی تیاریاں شروع کر دیں میری اور نازش (ظفیر احسن کی بہن) کی بہت زیادہ دوستی تھی میں نے نیل کے دل کا حال جانے بغیر ہی نازش کو اپنے دل کا حال سنا کر شادی رکوانے کی بات کی اور میری خوش قسمتی تھی کہ ہماری باتیں ظفیر احسن نے سن لی تھیں مگر میں اس وقت اس بات سے لاعلم تھی ماموں جان کے گھر سے نکل رہی تھی کہ نیل گیلانی وہاں آ گئے انہوں نے مجھے پہلی دفعہ مخاطب کیا تھا۔

”سنا ہے آپ کی شادی ہو رہی ہے؟“ میرا سر اثبات میں ہل گیا تھا اور جانے کے لیے آگے بڑھی تھی کہ پیچھے سے گھمبیر آواز گونجی تھی۔

”نئی! آپ کو کب سے میں دل میں بسائے ہوئے تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ مجھے میری محبت بھی نہ ملے گی کاش کہ آپ میری زندگی میں شامل ہو سکتیں۔“ نیل کا اظہار محبت مجھے یہ بھلا گیا تھا کہ کچھ ہی ماہ بعد میری شادی ہے میں بس اسی لمحے میں جینے لگی تھی جب نیل نے مجھ سے اقرار محبت کیا تھا۔ ظفیر احسن نے ہماری باتیں سنیں اور انہوں نے خود نیل گیلانی کو اپنی ماں کو بھیجنے کے لیے کہا تھا مگر نیل کی والدہ راضی نہیں ہو رہی تھیں مجھے فکر تو ہوتی تھی مگر میں نیل کے دلاسوں کے سہارے جی رہی تھی ہر بار ان سے بات کرنے کے بعد میرے چہرے پر قوس و قزح کے رنگ بکھر سے جاتے تھے میں نے اپنے لیے تو جینا ہی چھوڑ دیا تھا میری والدہ روبر میں نیل کے پسندیدہ کمرز کے کپڑے سج گئے تھے یلو کلمیر افیورٹ تھا مگر نیل کے سرسری سے کہنے پر انہیں یہ رنگ پسند نہیں میں نے یلو کلمر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا چھوڑ دیا نیل کو جوڑیاں بہت پسند تھیں میرے ہاتھ میں کالج کھٹکنے لگا

نیل کو لمبے بال پسند تھے اور میں نے بال ترشوانا چھوڑ دیئے نیل کو بے وجہ بولتی اور قہقہے لگاتی لڑکیاں نا پسند تھیں میں نے دھیمے دھیمے بولنا اور اپنے آپ سکرانا سیکھ لیا میں نجمہ اسد کہیں بھی نہ رہی تھی میرے چار سو نیل گیلانی کی محبت کا سایہ ہو گیا تھا۔ نیل کو کھونے سے بڑا ڈر لگتا تھا اور پھر یہی ڈر میری زندگی بن گیا کھونے والی چیز تو بالآخر کھو ہی جاتی ہے بھی پا کر اور بھی پانے سے پہلے۔“ لفظ بھر کو وہ خاموش ہو میں تھیں کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا۔

”میں نیل کو کھونے سے ڈرتی تھی اور وہ مجھے پانے کے خواہشمند تھے اپنی ماں کو منانے میں ناکام ہو کر انہوں نے کورٹ میرج کی مجھے راہ دکھائی میرے انکار پر وہ ناراض ہو گئے 3 دن مجھ سے بات نہ کی اور میں ان کی بے رخی برداشت نہ کر سکی اور اسپتال پہنچ گئی زندگی اور موت کی کشمکش میں 2 دن گزار کے میں گھر لوٹ آئی اور میرے پیرنس اور ماموں جان وغیرہ نے میرا نکاح نیل سے پڑھوا دیا اور جب نیل مجھے اماں کے پاس لائے تو انہوں نے مجھے ٹھکرا دیا اور نیل ماں کے قدموں میں بیٹھ گئے اور اماں نے ترس کھا کر مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا نیل تو ماں کے کہنے پر ہی چلتے تھے جبکہ اماں نے پہلے ہی دن سے مجھ سے پیر سایا بندھ لیا تھا وہ اور رضیہ باجی نیل کے سامنے مجھے کچھ نہ کہتیں مگر ان کے پیچھے پیچھے وہ کون سا زخم ہے جو انہوں نے مجھے نہ لگایا۔ مجھے میکے جانے کی اجازت نہ تھی نیل کا کہنا تھا جب ان کی ماں کا غصہ ٹھنڈا ہو گا میں میکے جانے لگوں گی میرے بابا بیمار تھے جب بھی میں ان سے ملنے نہ جاسکی اور جب ان کی ڈیڑھ کی خبر ملی تو نیل شہر سے باہر تھے میں نے اماں کے سامنے ہاتھ جوڑے ان کے پیر پڑی مگر انہوں نے باپ کا آخری دیدار اور شوہر کے ساتھ میں سے کسی ایک کو ملنے کے لیے کہا میں ان کی سنگدلی پر تڑپ اٹھی مگر

مشرقی عورت شوہر کی دلیر عبور نہ کر سکی اپنا گھر بچانے کے لیے باپ کا دیدار نہ کیا مگر مری پھر بھی میں ہی بنی۔ نیل کے آنے پر اماں نے ان سے جانے کیا کہا کہ وہ میری ماں کے بھی خلاف ہو گئے اور میں اس آدمی ادھوری ملاقات سے بھی گئی کیونکہ کبھی کبھار نیل میری ان سے فون پر بات کروا دیتے تھے۔ زندگی کی کٹھنائیوں میں نئے مہمان کی آمد نے مجھے ایک بار پھر سے زندہ کر دیا اماں اٹھتے بیٹھتے پوتے کی خواہش کا اظہار کرتیں مگر نیل بالکل خاموش تھے اور باپ بننے کی خوشی ان کے چہرے سے جھلکتی تھی اور جب میں نے ایک بیٹی کو جنم دیا تو اماں اُسے دیکھ بٹا ہی اسپتال سے چلی گئیں اور میں بہت زیادہ خوفزدہ تھی مگر جس وقت نیل نے بیٹی کو گود میں اٹھا کر اس کی پیشانی چومی اور اسے رافعہ نام دیا تو میرے سارے خوف زائل ہو گئے مگر یہ میری خام خیالی تھی بعد میں کبھی انہوں نے رافعہ کو گود میں نہیں اٹھایا اور جب اللہ نے مجھے ایک بار پھر خوشی سے نوازا اور اماں کی وہی رٹ کہ انہیں پوتا چاہیے اور اس دفعہ تو نیل نے بھی صاف بیٹے کے لیے کہہ دیا تھا میں بہت حسرت سے نیل کو دیکھا کرتی تھی مگر میں اپنی بیٹی اور آنے والے بچے کے لیے زندہ رہنے پر مجبور تھی ان ہی دنوں میں مجھے اماں جان کی خراب طبیعت کی اطلاع ملی میں اپنی ماں کے پاس جانا چاہتی تھی مگر اماں کی بے حس طبیعت نے مجھے اپنی ماں سے ملنے نہ دیا مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔“ نجمہ کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

”شاید۔۔۔ رب کو میری حالت پر رحم آ گیا تھا میں جو باپ کے آخری دیدار سے محروم ہو گئی تھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی ایسی راہ نکالی کہ میں اپنی ماں سے ملنے میں کامیاب ہو گئی میں نیل کے ساتھ منتقلی چیک اپ کے لیے گئی تھی وہیں مجھے ماموں جان نظر آ گئے اور میں ان کی مدد سے اپنی ماں سے ملنے میں کامیاب ہو گئی میں اپنی ماں سے پورے 3 سال بعد ملی تھی اور

ہمیں یہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی، گلاس لینے چلتے ہیں۔ وہ اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اٹھ گئی تھی۔ تسبیح کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو خود کو بڑا سینٹ سمجھتے کر رکھتے ہیں، سارہ اسے اپنی ہر چھوٹی بڑی بات بلا جھجک کہہ دیتی تھی جبکہ وہ ایسا نہیں کر پاتی تھی، اسے دوسروں پر اعتبار آتا ہی نہیں تھا جبکہ یہ غلط بھی تھا کیونکہ وہ نہ کسی سے اپنی باتیں شیئر کرتی تھی اور نہ ہی اسے ڈائری لکھنے کی عادت تھی اور یہی وجہ ہے جو وہ دن بدن تلخ ہوتی جا رہی تھی، ایک دفعہ ہی سہی اس کے دل کا غبار نکل جاتا تو وہ مطمئن ہو جاتی لیکن وہ تو اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی، اسے اپنے پیاجانی کا سرد روئیہ بڑا لگتا تھا، ماں کی خاموشی چھپتی تھی مگر وہ سوائے طنز کے کچھ نہیں کر پاتی تھی اور یہ بات اسے سب کی نظروں میں بڑا ہتار ہی تھی۔

☆☆☆

رافدہ کا نیل گیلانی کے جاننے والوں کے توسط سے رشتہ آیا تھا، لڑکا انٹر پاس تھا اور ان کی اپنی کپڑے کی دکان میں تھیں رشتہ اچھا تھا لڑکے کے گھر والے بھی معقول لگ رہے تھے مگر انہیں شادی کی جلدی تھی، نجمہ گیلانی تو ایک ماہ کے اندر شادی کرنے پر معترض تھیں مگر ان کی کہاں چلتی تھی، نیل گیلانی نے شادی کی تاریخ دے دی تھی، نفسہ بانو جو رافدہ کی شادی جھشید سے کروانے کا سوچے بیٹھی تھیں آنا فانا شادی پر ان کی امیدوں پر پانی سا پھر گیا تھا اور ایک ماہ کے اندر اندر ہی رافدہ بیاہ کر سسرال چلی گئی تھی۔

☆☆☆

”بہت خوش لگ رہی ہو کیا بات ہے؟“ تسبیح نے سارہ کے جگمگاتے چہرے کو دیکھ کر پوچھا تھا۔ ”پھپھو جانی پاکستان شفٹ ہو گئی ہیں اور اگلے ماہ میری اور شرنیل کی شادی ہے۔“ اس نے شرماتے ہوئے بتایا تھا۔ ”بہت بہت مبارک ہو۔“ بیانے مسکرا کر کہا تھا۔

کیس محسوس نہیں کیا؟“ رافدہ کچھ بے یقینی سی تھی۔ ”میں تم تینوں کی ماں ہوں اور تم لوگ مجھ سے بہت پیار کرتی ہو اس لیے اپنی دادی اور باپ کی تلخ بات اور بڑا رویہ میرے ساتھ تمہیں برداشت نہیں ہوتا، نیل! اپنی ماں سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ خدا کے بعد اگر کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو وہ اپنی ماں کو سجدہ کرتے نہ تھکتے، نیل کے لیے ان کی ماں کا کہا ہر لفظ بہت معتبر ہے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ نیل کا یقین ٹکڑا جائے ورنہ موقع تو کئی بار ایسے آئے کہ میں اماں جان کا چہرہ بے نقاب کر سکتی تھی مگر اس طرح وہ ٹوٹ جاتے اور میں نے خود ٹوٹ کر انہیں ٹوٹنے سے بچایا ہے کیونکہ میں کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ نیل کا مان ٹوٹے۔“ نجمہ گیلانی کے چہرے پر ماضی کی المناک تصویریں سی پھٹی تھیں، وہ اپنا غم پہلی دفعہ کسی کے سامنے کہتیں اٹھ گئیں تھیں۔

☆☆☆

”بیا! تم نے مجھے بہت ڈس ہارٹ کیا ہے، میری برقعہ ڈسے پارٹی میں نہیں آسکی تھیں تو فون کر کے تو مجھے وٹس کر سکتی تھیں، مان لو بیا! ہماری فرینڈ شپ میں میرے حوصلہ کا کمال ہے ورنہ کوئی تم جیسی زوڈ لڑکی کو ایک دن برداشت نہیں کر سکتا اور کہاں تمہیں جھیلنے مجھے تیسرا سال ہے۔“ سارہ نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھی۔ ”بیارنگلی سوری یار! میں تو مذاق کر رہی تھی۔“ وہ اسے روتے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ ”سوری.....“ اس نے شرمندگی سے آنسو پونچھے تھے۔

”بیا نیل می یار! میں تمہیں جانتی ہوں، ضرور کوئی بڑی بات ہے ورنہ تم اس طرح ری ایکٹ کبھی نہیں کرتیں۔“ وہ اسے پانی کی بوتل دیتے ہوئے استفسار کر رہی تھی۔

”سارہ! سیر سلی کوئی بات نہیں ہے، میرے سر میں درد ہے بس اسی لیے تم پریشان نہ ہو اور

میں چلتے ہوئے سہتہ گئی، کبھی پلٹ کر نیل سے اپنا قصور نہیں پوچھا، جس شخص سے میں نے ہمیشہ پیار بھری باتیں سننا چاہی تھیں کیونکہ عورت اور مرد کی محبت میں فرق ہوتا ہے، عورت محبت کی خاطر خود کو بھی قربان کر دیتی ہے اور مرد اس کی قربانی کو کسی طے کی طرح اپنے سینے پر بجا کر سرخرو ہو جاتا ہے، محبت تو ہم دونوں نے کی تھی مگر کھویا صرف میں نے، باپ اور ماں اپنی الہی جوش و شگ شرارتیں، قیمتی دل کی خوشی، لبوں کی سی مسکراہٹ، سب کچھ میں نے ایک شخص کی محبت میں قربان کر دیا مگر وہ شخص جو مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتا تھا وہ مجھے عزت و مان تک نہ دے سکا اور میں اپنے ٹوٹے خوابوں کی کرچیوں سنگ آج بھی صرف اس امید پر زندہ ہوں کہ زندگی کے آخری موڑ پر ہی سہی کبھی تو اسے اپنی محبت کو زندہ کرنے کا خیال آئے گا، وہ میری وفاؤں کا کچھ تو مجھے صلہ دے گا، ہے نہ کتنی عجیب بات، پھر بھی اس سے محبت کرتی ہوں اور اس سے ایک اظہار سننے کی متمنی ہوں، میں پاگل نہیں ہوں مگر مجھے محبت نے دیوانہ کر دیا ہے اور محبت ایسے ہی بے بس کر دیا کرتی ہے۔“ نجمہ گیلانی کو وہ تینوں ہی کافی حیرت سے دیکھ رہی تھیں کہ ان کی ماں کتنی عظیم تھی اور اپنی محبت میں کتنی سچی اور پر خلوص تھی جس کی ان کا باپ قدر نہ کر سکا، وہ خاموشی سے ان تینوں کو بیٹھا دیکھ کر دلگدگی سے اپنے آنسو صاف کرنے لگی تھیں۔

”امو جان! آپ جب پہنچ جاتی ہیں اتنی محبت کرتی تھیں تو اپنی اسی محبت کے ذریعے اپنے ہونے کا احساس دلاتیں۔“ راعیہ ان کا ہاتھ تھامے غم لہجے میں کہتی ان کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی مگر ان کے کچھ بھی کہنے سے پہلے رافدہ بول پڑی تھی۔

”امو جان! پہنچ جانی کو اتنے برسوں میں کبھی بھی نہیں لگا کہ ان کی ماں آپ کے ساتھ زیادتی کرتی ہیں، جب ہم وادی کا رویہ محسوس کر سکتے ہیں تو پہنچ جانی نے

وہ دن ہی میری ماں کی زندگی کا آخری دن تھا، ماں کی موت نے مجھے بہت بڑا حال کر دیا تھا، صدمے کی وجہ سے میں تو اپنی سدا بدھ ہی ٹھوٹھوٹھی تھی اور ایسے میں تین دن بعد میں نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا جس میں سے ایک زندہ اور ایک مردہ تھا، نیل نے بیٹی کو اس بار ایک نگاہ دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا، وہ مجھے اور میری بیٹی کو اپنے بیٹے کی موت کا ذمہ دار تصور کرتے تھے رافدہ کو تو وہ کبھی کوئی چیز لا دیتے تھے مگر تسبیح سے انہیں ایک چیز ہی ہو گئی تھی، مگر وہ جتنا اسے نظر انداز کرتے یہ اتنا ہی ان کی جانب لپکتی تھی مگر نیل پر بار چھڑک دیتے، اماں جان تو تسبیح سے بہت چڑتی تھیں مگر اس نے نین نقش باپ کے چرائے تھے اس لیے وہ تسبیح کو زیادہ کچھ کہہ نہیں پاتی تھیں، تسبیح کے بعد راعیہ اس دنیا میں آگئی تھی اور اس کے بعد تو بیٹے کی آئیں ہی مر گئی، اماں جان مجھے کو سننے دیتیں نہ تھکیں، میں ان کے اکلوتے وارث کو ایک وارث نہ دے سکی، اماں جان نیل کی دوسری شادی کرنا چاہتی تھیں اور مجھے لگتا تھا کہ وہ اماں جان کی بات ایک نہ ایک دن مان لیں گے مگر میری کبی اور سوچی گئی بات کبھی پوری ہو ہی نہیں سکی تھی، مجھے لگتا تھا کہ نیل مجھ سے بہت محبت کرتے تھے مگر شادی کے بعد کبھی مجھے نہیں لگا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے مجھے ہزاروں خوشنما خواب دکھائے تھے جو میری چاہت کی خاطر اپنی ماں کی مرضی کے بھی خلاف ہو گیا تھا، میں نے شادی کے بعد نیل کو پایا نہیں تھا وہ تو مجھ سے کہیں راستے میں گھجڑ گئے تھے، ہم ساتھ چلتے تھے ہماری خوشیاں ہمارے دکھ ایک تھے، میری چاہت وہی تھی مگر نیل کے احساس بدل گئے تھے، میں نے تو نیل کو دل میں جگہ دینے کے بعد انہیں اپنا سب کچھ مان چکی تھی، شادی کے بعد میری چاہت میں کوئی کمی نہ آئی، میں نے مکمل خود کو نیل کی پسند کے سانچے میں ڈھال لیا، ان کی ماں کی نفرت کو بھی ان کی محبت کی آگ

”تم نے میری شادی میں ضرور آنا ہے اور نہ آئی تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔“ اس نے دھمکی دی تھی۔
”میں ہر فلکشن میں آنے کا وعدہ نہیں کر سکتی لیکن بارات میں ضرور آؤں گی۔“ اس نے حامی بھر لی تھی۔
رافعہ کی شادی میں وہ پیش پیش رہی تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ امواجان اسے زیادہ نہیں تو بارات میں جانے کی اجازت تو دلوا ہی دیں گی جبکہ سارہ اسی پر خوش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”اماں! آخر آپ کب ماموں جان سے میرے اور بیا کے رشتے کی بات کریں گی؟“ کھانا کھاتی ہوئی رضیہ بانو شوہر کی موجودگی اور بیٹے کی بات کی وجہ سے گڑبڑا کر رہ گئی تھیں۔

”بیگم! جب ہمارا بیٹا تسبیح بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کس بات کا انتظار ہے۔“ احمد صاحب کی بات سے جہاں رضیہ بانو کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں زہیر تو جیسے گل اٹھا تھا۔

”اماں! اب تو آپ بالکل دیر نہیں کریں گی کیونکہ ابوجان کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ زہیر نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”تم باپ بیٹا تو پھٹی پر سروسو جمانے پر تلے بیٹھے ہو، نیل نے کچھ عرصہ پہلے ہی ایک بیٹی بیا ہی ہے وہ اب اتنی جلدی دوسری بیٹی کی شادی میرا نہیں خیال کہ کر پائے گا۔“ وہ بڑی طرح پھنس چکی تھیں۔

”بیگم یہ بھی خوب کہی آپ نے“ ہمیں کون سا نیل سے جینز لینا ہے اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے اور ہم تسبیح بیٹی کو چار جوڑوں.....“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں احمد! نیل کبھی اپنی بیٹی کو ایسے رخصت نہیں کرے گا“ ذیشان نے بھی صاف منع کر دیا تھا مگر لڑکی والے اپنی ناک پیچی تو نہیں کر سکتے اور میں نے زہیر اور بیا کے متعلق اماں سے بات کر لی ہے وہ کہہ رہی تھیں کہ کسی مناسب وقت پر نیل

سے بات کر لیں گی اور مجھے تو ویسے بھی ابھی زہیر کی شادی کی اتنی فکر نہیں ہے میں پہلے سمیہ کو اس گھر سے رخصت کروں گی اور پھر ہی بہو لاؤں گی اور بیا میں دیکھنے میں تو کوئی خرابی نہیں ہے مگر وہ زبان کی کچھ کڑوی ہے اس لیے آپ باپ بیٹا اچھی طرح سوچ لو کیونکہ جو بھی لڑکی اس گھر میں بہو بن کر آئے گی اسے میرے جشید کا بھی خیال رکھنا پڑے گا اور مجھے نہیں لگتا کہ بیا ایک دن بھی اپنے جینہ کو برداشت کر پائے گی اس کے علاوہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ وہ ڈھکے چھپے انداز میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی اٹھ گئی تھیں۔

”تم پریشان نہ ہو بیٹا! تسبیح بیٹی کو میں بچپن سے جانتا ہوں اب وہ اتنی بھی بد لحاظ نہیں ہے بس رضیہ ہی ایک ماں کی طرح سوچ رہی ہے اور جشید کی دماغی حالت سے تو تم واقف ہی ہو وہ اب بھی گیارہ سال کا بچہ ہی ہے اور اسے دیکھ کر دکھ کا شکار ہو جاتی ہے اور اب تو نئے نئے خدشات اور وہم پالنے لگی ہے مگر تو فکر نہ کر ہم تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔“ احمد صاحب کی چہر بیوی سے مختلف تھی اور بچے کا کافی حد تک انہی پر گئے تھے زہیر کچھ دیر ماں اور باپ کی باتوں کو سوچتا سب کچھ وقت پر چھوڑ کر باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

”اماں! آپ نیل سے رافعہ اور جشید کے رشتے کی بات تو نہ کر سکیں اور رافعہ کسی اور کے سنگ چلی گئی مگر میں اس بیا کو اپنی بہو سمجھی نہیں بناؤں گی زہیر کے لیے میں نے لڑکی دیکھ لی ہے امیر خوبصورت اور سب سے بڑھ کر معصوم اور بھولی بھالی زہیر بھی انکار نہیں کر پائے گا۔“ رضیہ بانو بہت بڑا اعتماد و یقین تھیں۔

”تم کس کی بات کر رہی ہو؟ کہاں فکر اگئی تمہیں معصوم اور بھولی بھالی لڑکی؟ ورنہ تو ہر لڑکی ہی تمہیں پٹاخہ اور جانے کیا کیا لگتی ہے۔“ وہ ہنستے

ہوئے بول رہی تھیں۔

”بڑا ق نہیں کر رہی میں کسی اور کی نہیں رافعہ کے میاں کی بھی فوزیہ کی بات کر رہی ہوں۔“ رضیہ بانو ماں کے ہنسنے پر براہمان ہو گئی تھیں۔

”باؤلی ہوئی ہے رضو! مانا کہ وہ بہت خوبصورت ہے مگر اپنے خاندان کی بہت لاڈلی ہے ایک دن بھی تجھ جیسی لڑاکا کے ساتھ گزارا نہیں کر پائے گی اور زہیر کیا وہ راضی ہو جائے گا۔“ نفیسہ بانو نے سچائی سے بیٹی کو اس کی برائی سے آگاہ کیا تھا۔

”اماں! میں لڑاکا ہوں تو کیا ہوا؟ مگر تو آپ پر ہی ہوں۔“ رضیہ بانو کہاں چوکنے والی تھیں اور وہ صرف بیٹی کو گھور کر رہ گئی تھیں۔

”اماں! میں ایک تیر سے دو نشانے لگانا چاہتی ہوں فوزیہ سے زہیر کی شادی کرنے سے اس بیا سے جان تو چھوٹے گی ہی مگر لاکھوں کا جینز بھی ساتھ آئے گا نیل نے رافعہ کو اپنی اوقات سے بڑھ کر جینز دیا ہے اور تسبیح کو دینے کے لیے اس کے پاس مجھے نہیں لگتا کہ کچھ زیادہ بجا ہو گا فوزیہ کو انہوں نے نازوں سے بالا ہے تو جینز بھی کافی سارا دیں گے اور اماں اس لڑکی کو تو آپ نے دیکھا ہی ہے کافی معصوم اور دنیا داری سے الگ ہے وہ بہو بن کر آ جائے گی تو مجھے بیٹے کے ہاتھ سے نکلنے کا خطرہ نہیں رہے گا جبکہ بیا سے شادی کرنے کا مطلب ہے کہ میں اپنا بیٹا کھو دوں رہ گئی بات زہیر کی اسے سمجھانا مشکل تو ہو گا مگر میں کیسے بھی کر کے اسے شادی پر راضی کر ہی لوں گی اور شادی کے بعد وہ معصوم اور خوبصورت بیوی کو دیکھ کر پرانی ساری محبتیں بھول جائے گا۔“ رضیہ بانو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ماں پر گاڑے اُن کے اثرات دیکھ رہی تھیں۔

”واہ رضو! اس بار تو نے کمال ہی کر دیا۔“ وہ خوش ہو گئیں تھیں۔

”بس اماں! تم دیکھتی جاؤ کہ میں کیسے اس بیا کا پتا

صاف کرتی ہوں۔“ وہ شاطرانہ انداز میں کوئی چال چلنے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

”رضو! تو نے کیا سوچا ہے کچھ مجھے بھی بتا“ کہیں تو کچھ غلط ہی نہ کر بیٹھے۔“ انہیں اسے آگے کوئی نظریہ کب آتا تھا وہ خود کو عقل کل سمجھتی تھیں۔ رضیہ بانو نے چڑتے ہوئے اپنا منصوبہ انہیں بتا دیا تھا۔

”پاگل ہو گئی رضو! تو رشتہ لے جائے بغیر بیٹے سے کہے گی کہ نیل نے بیا کی وجہ سے انکار کر دیا ہے تو وہ سکون سے بیٹھ جائے گا اور تیری من پسند لڑکی سے شادی کر لے گا تو یہ تیری بے وقوفی ہے جس طرح وہ بیا سے شادی کے لیے زور ڈال رہا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اتنے آرام سے نہیں بیٹھے گا وہ بیا سے تو ضرور پوچھے گا اور وہ اتنی منہ پھٹ ہے صاف کہہ دے گی تم نے رشتہ ڈالا ہی نہیں اور بات بننے کی بجائے بڑ جائے گی انہوں..... تو کچھ نہیں کر سکتی مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“ نفیسہ بانو سوچنے لگی تھیں۔

”اماں! جو کرنا ہے تین سے چار ہفتوں میں ہی کرنا ہے میں تو کہتی ہوں کہ اس بیا کی کہیں شادی ہو جائے میری تو جان چھوٹے گی۔“ رضیہ بانو بیا کو برا بھلا کہنے میں مصروف تھیں اور ان کا شاطر دماغ ایک پلان ترتیب دینے لگا تھا۔

”واہ اماں! تم نے تو کمال ہی کر دیا“ کیا دماغ چلایا ہے اس طرح تو سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی۔“
”انکار کی اہمیت تو بیا کے اندر نہ ہو گی مگر تو بس دھیرج رکھ زہیر پنڈی سے آ کر تجھ سے کوئی بات کرے تو تو مناسب وقت پر بات بڑھانے کا کہہ کر اسے خاموش کر دینا اور میں موقع دیکھ کر نیل سے بات کر لوں گی۔“

”اماں! پہلے کی طرح موقع نہ ڈھونڈتی رہ جانا“ ایک تو پھر سے اڑ گئی اور اب دوسری کو بھی.....“ نفیسہ بانو اور رضیہ ہنسنے لگی تھیں۔

”اور اماں! ایسا کرنے سے نجمہ کا ماتھا ٹھک جائے

”تم نے میری شادی میں ضرور آنا ہے اور نہ آئی تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔“ اس نے دھمکی دی تھی۔
”میں ہر فلکشن میں آنے کا وعدہ نہیں کر سکتی لیکن بارات میں ضرور آؤں گی۔“ اس نے حامی بھر لی تھی۔
رافعہ کی شادی میں وہ پیش پیش رہی تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ امواجان اسے زیادہ نہیں تو بارات میں جانے کی اجازت تو دلوا ہی دیں گی جبکہ سارہ اسی پر خوش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”اماں! آخر آپ کب ماموں جان سے میرے اور بیا کے رشتے کی بات کریں گی؟“ کھانا کھاتی ہوئی رضیہ بانو شوہر کی موجودگی اور بیٹے کی بات کی وجہ سے گڑبڑا کر رہ گئی تھیں۔

”بیگم! جب ہمارا بیٹا تسبیح بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کس بات کا انتظار ہے۔“ احمد صاحب کی بات سے جہاں رضیہ بانو کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں زہیر تو جیسے محل اٹھا تھا۔

”اماں! اب تو آپ بالکل دیر نہیں کریں گی کیونکہ ابو جان کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ زہیر نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”تم باپ بیٹا تو پھٹی پر سروسو جمانے پر تلے بیٹھے ہو، نیل نے کچھ عرصہ پہلے ہی ایک بیٹی بیا ہی ہے وہ اب اتنی جلدی دوسری بیٹی کی شادی میرا نہیں خیال کہ کر پائے گا۔“ وہ بڑی طرح پھنس چکی تھیں۔

”بیگم یہ بھی خوب کہی آپ نے“ ہمیں کون سا نیل سے جہیز لینا ہے اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے اور ہم تسبیح بیٹی کو چار جوڑوں.....“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں احمد! نیل کبھی اپنی بیٹی کو ایسے رخصت نہیں کرے گا“ ذیشان نے بھی صاف منع کر دیا تھا مگر لڑکی والے اپنی ناک پیچی تو نہیں کر سکتے اور میں نے زہیر اور بیا کے متعلق اماں سے بات کر لی ہے وہ کہہ رہی تھیں کہ کسی مناسب وقت پر نیل

سے بات کر لیں گی اور مجھے تو ویسے بھی ابھی زہیر کی شادی کی اتنی فکر نہیں ہے میں پہلے سمیہ کو اس گھر سے رخصت کروں گی اور پھر ہی بہو لاؤں گی اور بیا میں دیکھنے میں تو کوئی خرابی نہیں ہے مگر وہ زبان کی کچھ کڑوی ہے اس لیے آپ باپ بیٹا اچھی طرح سوچ لو کیونکہ جو بھی لڑکی اس گھر میں بہو بن کر آئے گی اسے میرے جشید کا بھی خیال رکھنا پڑے گا اور مجھے نہیں لگتا کہ بیا ایک دن بھی اپنے جشید کو برداشت کر پائے گی اس کے علاوہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ وہ ڈھکے چھپے انداز میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی اٹھ گئی تھیں۔

”تم پریشان نہ ہو بیٹا! تسبیح بیٹی کو میں بچپن سے جانتا ہوں اب وہ اتنی بھی بد لحاظ نہیں ہے بس رضیہ ہی ایک ماں کی طرح سوچ رہی ہے اور جشید کی دماغی حالت سے تو تم واقف ہی ہو وہ اب بھی گیارہ سال کا بچہ ہی ہے اور اسے دیکھ کر دکھ کا شکار ہو جاتی ہے اور اب تو نئے نئے خدشات اور وہم پالنے لگی ہے مگر تو فکر نہ کر ہم تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔“ احمد صاحب کی چہرہ بیوی سے مختلف تھی اور بچے کا کافی حد تک انہی پر گئے تھے زہیر کچھ دیر ماں اور باپ کی باتوں کو سوچتا سب کچھ وقت پر چھوڑ کر باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

”اماں! آپ نیل سے رافعہ اور جشید کے رشتے کی بات تو نہ کر سکیں اور رافعہ کسی اور کے سنگ چلی گئی مگر میں اس بیا کو اپنی بہو کبھی نہیں بناؤں گی زہیر کے لیے میں نے لڑکی دیکھ لی ہے امیر خوبصورت اور سب سے بڑھ کر معصوم اور بھولی بھالی زہیر بھی انکار نہیں کر پائے گا۔“ رضیہ بانو بہت بڑا اعتماد و ہر یقین تھیں۔

”تم کس کی بات کر رہی ہو؟ کہاں فکر اگئی تمہیں معصوم اور بھولی بھالی لڑکی؟ ورنہ تو ہر لڑکی ہی تمہیں پٹا بخور جائے کیا کیا لگتی ہے۔“ وہ ہنستے

ہوئے بول رہی تھیں۔

”بزدلی نہیں کر رہی میں کسی اور کی نہیں رافعہ کے میاں کی بھی فوزیہ کی بات کر رہی ہوں۔“ رضیہ بانو ماں کے ہنسنے پر براہمان لگی تھیں۔

”باؤلی ہوئی ہے رضو! مانا کہ وہ بہت خوبصورت ہے مگر اپنے خاندان کی بہت لاڈلی ہے ایک دن بھی تجھ جیسی لڑاکا کے ساتھ گزارا نہیں کر پائے گی اور زہیر کیا وہ راضی ہو جائے گا۔“ نفیسہ بانو نے سچائی سے بیٹی کو اس کی برائی سے آگاہ کیا تھا۔

”اماں! میں لڑاکا ہوں تو کیا ہوا؟ مگر تو آپ پر ہی ہوں۔“ رضیہ بانو کہاں چوکنے والی تھیں اور وہ صرف بیٹی کو گھور کر رہ گئی تھیں۔

”اماں! میں ایک تیر سے دو نشانے لگانا چاہتی ہوں فوزیہ سے زہیر کی شادی کرنے سے اس بیا سے جان تو چھوٹے گی ہی مگر لاکھوں کا جہیز بھی ساتھ آئے گا نیل نے رافعہ کو اپنی اوقات سے بڑھ کر جہیز دیا ہے اور تسبیح کو دینے کے لیے اس کے پاس مجھے نہیں لگتا کہ کچھ زیادہ بجا ہو گا فوزیہ کو انہوں نے نازوں سے بالا ہے تو جہیز بھی کافی سارا دیں گے اور اماں اس لڑکی کو تو آپ نے دیکھا ہی ہے کافی معصوم اور دنیا داری سے الگ ہے وہ بہو بن کر آ جائے گی تو مجھے بیٹے کے ہاتھ سے نکلنے کا خطرہ نہیں رہے گا جبکہ بیا سے شادی کرنے کا مطلب ہے کہ میں اپنا بیٹا کھو دوں رہ گئی بات زہیر کی اسے سمجھانا مشکل تو ہو گا مگر میں کیسے بھی کر کے اسے شادی پر راضی کر ہی لوں گی اور شادی کے بعد وہ معصوم اور خوبصورت بیوی کو دیکھ کر پرانی ساری محبتیں بھول جائے گا۔“ رضیہ بانو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ماں پر گاڑے اُن کے اثرات دیکھ رہی تھیں۔

”واہ رضو! اس بار تو نے کمال ہی کر دیا۔“ وہ خوش ہو گئیں تھیں۔

”بس اماں! تم دیکھتی جاؤ کہ میں کیسے اس بیا کا پتا

صاف کرتی ہوں۔“ وہ شاطرانہ انداز میں کوئی چال چلنے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

”رضو! تو نے کیا سوچا ہے کچھ مجھے بھی بتا“ کہیں تو کچھ غلط ہی نہ کر بیٹھے۔“ انہیں اسے آگے کوئی نظریہ کب آتا تھا وہ خود کو عقل کل سمجھتی تھیں۔ رضیہ بانو نے چڑتے ہوئے اپنا منصوبہ انہیں بتا دیا تھا۔

”پاگل ہو گئی رضو! تو رشتہ لے جائے بغیر بیٹے سے کہے گی کہ نیل نے بیا کی وجہ سے انکار کر دیا ہے تو وہ سکون سے بیٹھ جائے گا اور تیری من پسند لڑکی سے شادی کر لے گا تو یہ تیری بے وقوفی ہے جس طرح وہ بیا سے شادی کے لیے زور ڈال رہا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اتنے آرام سے نہیں بیٹھے گا وہ بیا سے تو ضرور پوچھے گا اور وہ اتنی منہ پھٹ ہے صاف کہہ دے گی تم نے رشتہ ڈالا ہی نہیں اور بات بننے کی بجائے بڑبڑائے گی انہوں..... تو کچھ نہیں کر سکتی مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“ نفیسہ بانو سوچنے لگی تھیں۔

”اماں! جو کرنا ہے تین سے چار ہفتوں میں ہی کرنا ہے میں تو کہتی ہوں کہ اس بیا کی کہیں شادی ہو جائے میری تو جان چھوٹے گی۔“ رضیہ بانو بیا کو برا بھلا کہنے میں مصروف تھیں اور ان کا شاطر دماغ ایک پلان ترتیب دینے لگا تھا۔

”واہ اماں! تم نے تو کمال ہی کر دیا“ کیا دماغ چلایا ہے اس طرح تو سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی۔“

”انکار کی اہمیت تو بیا کے اندر نہ ہو گی مگر تو بس دھیرج رکھ زہیر پنڈی سے آ کر تجھ سے کوئی بات کرے تو تو مناسب وقت پر بات بڑھانے کا کہہ کر اسے خاموش کر دینا اور میں موقع دیکھ کر نیل سے بات کر لوں گی۔“

”اماں! پہلے کی طرح موقع نہ ڈھونڈتی رہ جانا“ ایک تو پھر سے اڑ گئی اور اب دوسری کو بھی.....“ نفیسہ بانو اور رضیہ ہنسنے لگی تھیں۔

”اور اماں! ایسا کرنے سے نجمہ کا ماتھا ٹھک جائے

گا اور وہ اتنے برس خاموش رہی ہے ایسا نہ ہو کہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہی نہ ہو سکیں زہیر نے اجہ کو بھی بتا دیا ہے ان دونوں کی غیر موجودگی میں ہی یہ کام ہو سکتا ہے۔ رضیہ بالوماں کو دیکھنے لگی تھیں۔

”میں سنبھال لوں گی تو یہ بتا کہ زہیر واپس کب.....“

”السلام علیکم!“ زہیر کو دیکھ کر وہ چپ کر گئی تھیں۔ ”کوئی خاص بات ہے جو مجھے یاد کیا جا رہا ہے۔“ وہ ناتواں کے برابر بیٹھ گیا تھا۔

”تو نے بھی اچھی کمی مینا! تجھے خاص وقت پر کیوں ہم تو ہر وقت یاد رکھتے ہیں۔“ نفیسہ بانو شیریں لہجے میں بولی تھیں اور وہ چائے کا کپتا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

☆☆☆

”ڈیز ڈائری! جنب سے میں نے ایک دو شیئرہ کو دیکھا ہے دل و نظر کو نہیں قرار نہیں ہے میں نے حسن تو بہت دیکھا ہے مگر سادہ اور لا پرواہ حزن و ملال کی پرچھائی لیے حسن میری نگاہ سے پہلی دفعہ ٹکرایا ہے اس کی بڑی بڑی سیاہ غزالی آنکھوں کی گہرائی میں میرا دل ڈوب گیا ہے اس کا گلابی چہرہ اور غزالی آنکھیں میرے دل کے ایوانوں پر دستک دے رہی ہیں مگر میں اس کی سرد مہری و بے اعتباری کے باعث اپنے جذبوں کو نام دینے سے قاصر ہوں اس کی آنکھوں میں ہر وقت بے اعتباری کی دبیز چادر تپتی ہوئی ہے اور میں اب تک سمجھ نہیں پایا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ یہ میری نگاہ کا دھوکا ہے یا وہ واقعی ہر ایک سے بدگمان رہتی ہے؟ مجھے اس کے خیالات جاننے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا مگر ڈیز ڈائری! مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟ وہ سسڑکی فرینڈ ہے اور ”محبت“ لفظ سے بھی الگ ہے اور ایسی لڑکی جو لڑکوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی محبت کے مخالف ہے“ وقیع احسن لکھتے لکھتے تھک گیا

تھا، فرینڈ اس کی آنکھوں پر دستک دینے لگی تھی اور وہ ڈائری بند کرتا دل میں ہزاروں سوال اور الجھنیں لئے بستر پر دراز ہو گیا تھا اور جب تک اس کی آنکھ نہیں لگی تھی وہ سمجھ کے بازے میں ہی سوچتا رہا تھا اور فرینڈ کے بعد خوابوں میں بھی اسی سے محو گفتگو تھا کیونکہ محبت اس کے دل میں جنم لے چکی تھی۔

☆☆☆

”سو جان! سارہ کا فون آیا تھا اس کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کے گھر چلی جاؤں۔“ نجمہ گیلانی الجھن میں پڑ گئیں تھیں سارہ نے مذاق کی شادی میں بھرپور شرکت کی تھی اس لیے وہ بیٹی کو صاف انکار کرنے کی خود میں ہمت نہیں پارہی تھیں۔ ”چلی جاؤ بھی سارہ کافی اچھی لگی ہے۔“ وہ دونوں ماں بیٹی چونک گئی تھیں جبکہ زہیر کے ساتھ اندر داخل ہوتیں دادو مسکرانے لگی تھیں۔ وہ ایک ہفتہ سے بیٹی کے گھر گئی ہوئیں تھیں اور آج صبح ہی آفس کے کام سے گیا زہیر پنڈی سے لوٹا تھا تو وہ شام کو ہی واپس آ گئیں تھیں۔

”سوچ کیا رہی ہو بیا! زہیر تمہیں چھوڑ دے گا اور کچھ دیر بعد جب تم واپس آنا چاہو تب یہ تمہیں لے آئے گا۔“ زہیر کے دیکھتے ہی اس کے ماتھے پر سلوٹیں سی پڑ گئی تھیں نجمہ گیلانی اس کے بگڑتے زاویے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے خاموشی سے جانے کا اشارہ کر رہی تھیں جس پر وہ خاموشی سے کمرے میں گئی تھی اور سیاہ سوٹ کے ہمراہ سیاہ سا دروازے دھلے ہوئے منہ کے ساتھ چند منٹوں میں آ گئی تھی۔

”تم اپنی دوست کے چالیسویں میں نہیں اسے شادی کی مبارک.....“

”زہیر! انسان کی صورت اچھی نہ ہوتی بھی بات اسے اچھی کرنی چاہیے۔“ وہ ڈائری لکھ کر زہیر کو خفگی سے ٹوک گئی تھی جبکہ وہ بیٹنے لگا تھا۔

”مجھے میں گلابی چہرے پر پھیلتی سرخی تمہیں کچھ اور زیادہ حسین بنا دیتی ہے۔“ وہ اک ادا سے بولا تھا اور اس کی جان جل کر رہ گئی تھی۔

”تم یہ اپنے گھٹیا ڈائلاگ اپنی ہی جیسی بے ہودہ لڑکیوں کو سنایا کرو۔“ وہ تپ کر بولی تھی اور اس لمحے کو کوس رہی تھی جب زہیر کے ساتھ آنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

”میں نے اماں سے تمہاری اور اپنی شادی کی بات کی تھی۔“

”اور انہوں نے بد زبان پھوٹا اور جانے کیا کچھ کہہ کر اس شادی سے صاف انکار کر دیا“ بٹ فور یور کا سنڈ انفارمیشن مسٹر زہیر کہ تمہاری ماں کا انکار اور تمہارا اقرار میری ناں کوہاں میں نہیں بدل سکتا کیونکہ میں کسی اندھے لوے لنگڑے شخص سے شادی کر سکتی ہوں مگر تم سے نہیں۔“ وہ کہہ کر فرنیٹ ڈور کھول کر باہر نکل گئی تھی جبکہ وہ دھیرے سے مسکراتا گاڑی بڑھا لے گیا تھا۔

☆☆☆

”پھپھو جانی! یہ میری فرینڈ سمجھ گیلانی ہے۔“ وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں جب سارہ کے کمرے میں نازش سرمد داخل ہوئی تھیں اور سارہ نے ان کا پیاسے تعارف کروایا تھا۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں تاکہ شناسائی کی بلکی سی وین مل سکے جبکہ بیا آن کے اس طرح دیکھنے پر کٹیوڑ ہو گئی تھی۔

”بیٹا! تمہارے فادر کا کیا نام ہے؟“ انہوں نے پوچھا تھا اور اس نے اٹھتے ہوئے بتایا تھا۔

”نیل گیلانی۔“

”یورز مدر نیم نجمہ! آئی ایم رائٹ؟“ انہوں نے فوراً کہا تھا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

”میں اسی وقت تمہارے گھر جانا چاہتی ہوں۔“ نازش سرمد کے کہنے پر وہ حیران ہوئی تھی۔

”بٹ وائے پھپھو جانی؟“ سارہ حیران ہوئی تھی۔

”سارہ! سوال مت کرو اور اپنی دوست کے گھر چلو۔“ وہ لوگ کچھ ہی دیر میں ”گیلانی ہاؤس“ کے سامنے کھڑے تھے نجمہ مستقل بجتی ڈورنیل کی آواز پر فوراً گیٹ کھولنے آئی تھیں اور چونیں پچیس برس بعد سامنے کھڑی نازش کو دیکھ کر وہ خوشی کے احساس میں لپٹی اس کے گلے سے لگ گئی تھیں اور ان دونوں کی حیرت اب کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

”نزش! میں بتا نہیں سکتی اتنے سال بعد تمہیں اپنے روبرو دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔“ نجمہ اس کا ہاتھ تھامے چمکتے چہرے سے بولی تھیں۔

”میں تو دیکھ لو تم تک پہنچ ہی گئی جبکہ تم نے تو ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھائی جان سے بھی کوئی رابطہ نہ رکھا اور جب بھی میں نے USA سے تمہیں فون کیا تمہاری ساس نے بات نہیں کروائی اس لیے میں نے خاموشی اختیار کر لی مگر آج جب میں نے بیا کو دیکھا تو اس میں مجھے نیل بھائی کی کافی جھلک نظر آئی اور میں بچیوں کو حیران پریشان اپنے ساتھ لیے شک کو یقین میں بدلنے چلی آئی۔“ وہ بڑے جوش و خروش سے اپنا کارنامہ بتا رہی تھیں۔

”نازش! میں تو اپنے پیرنس سے تعلق کر دی گئی تھی تو ایسے میں تم سے یا ظفر احسن سے کہاں رابطہ کر سکتی تھی ماموں جان بھی کبھار آ جاتے تھے پھر انہوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔“

”بابا جان کو تو تم مجھ سے زیادہ عزیز تھیں خاموشی انہوں نے نہیں زندگی نے اختیار کی تھی۔“ نازش نے اپنے پیرنس کی موت کی خبر اسے دی تھی اور وہ بہت زیادہ دکھی ہو گئی تھیں۔

”شادی ہو کر تو میں USA چلی گئی تھی دو ماہ قبل ہی پاکستان شفٹ ہوئے ہیں ایک ہی بیٹا ہے اور یہ رہی میری بہو۔“ نازش نے کمرے میں چھا جانے والے سکوت کو توڑا تھا سارہ ان کے اس طرح کہنے پر جھینپ سی گئی تھی۔

”تہارے کتنے بچے ہیں اور یہ نیل بھائی کہاں ہیں؟“

”آفس سے نہیں لوٹے اور ہماری تین بیٹیاں ہیں سب سے بڑی والی کی دو ماہ قبل ہی نیل کے کسی جاننے والے کے توسط سے شادی ہوئی ہے“ تسبیحہ اور اس سے چھوٹی راعیہ سے خدا نے بیٹا.....“

”السلام علیکم!“ آواز پر چونک کر ان دونوں نے ہی دروازے کی جانب دیکھا تھا جہاں سمید کھڑا تھا۔

”نجمہ! ماشاء اللہ تمہارا بیٹا تو کافی خوبصورت اور نیل بھائی سے مشابہت رکھتا ہے۔“

”زشی! سمید میری نند کا بیٹا ہے۔“ انہوں نے بات کاٹ کر کہا تھا اور اسی وقت نفیسہ بانو کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

”ویری سوری بٹ مجھے لگا کہ یہ تمہارا بیٹا ہے کیونکہ نیل بھائی سے اس کی شکل کافی ملتی ہے۔“

”بی بی! اس میں حیرانگی والی کون سی بات ہے بچے باپ دادا پر جاتے ہیں یا خالہ ماموں پر اور سمید کسی غیر کا نہیں نیل کی سگی بہن کا بیٹا ہے۔“ نفیسہ بانو کے کہنے پر تازش کچھ شرمندہ ہو گئی تھیں۔

”سمید! ابھی سے کہاں چلے بیٹا چائے.....“

”ممائی جان! چائے پھر بھی سبھی اس وقت مجھے جلدی ہے“ سمید کا صبح پیر ہے اور میں راعیہ سے کتاب لینے آیا تھا“ تیاری تو اس نے کرنی ہے نہیں میں لیٹ ہو گیا تو سارا الزام مجھ معصوم پر آ جائے گا اس لیے اجازت دیجیے۔“ وہ خوشدلی سے کہتا باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”ریا! مجھے لگتا ہے تجھے وقیع بھائی سے محبت ہو گئی ہے۔“ چوڑیاں اتارتی ہوئی راعیہ ٹھک گئی تھی۔

”انہیں دیکھ کر گرم صم ہو جانا“ چہرے پر حیا کی لالی پلکوں کا عارضوں کو چھونا“ سب محبت ہی کی تو علامتیں ہیں۔“ سمید اسے شرارت سے دیکھ رہی تھی جبکہ اس کا

چہرہ ابو چھلکانے لگا تھا۔

”بکواس نہیں کر سومی! جودل میں آتا ہے کہہ دیتی ہے ایسا کچھ بھی نہیں ہے مجھی.....“ وہ جلدی سے کہتے ہوئے صبیح کرنے چلی گئی تھی۔ آج سارہ کی مہندی تھی وہ لوگ کچھ دیر پہلے ہی وہاں سے لوٹی تھیں۔

”ریا! ویسے تو نے دل بھی چھانٹ کر زبردست بندے سے لگایا ہے جہاں سے ان کے ساتھ گزرا کرے گی لوگ غش غش.....“ اس کے آتے ہی سمید نے سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا تھا“ راعیہ نے اسے نکیہ منہج کر مارا تھا اور وہ ہنسنے لگی تھی۔

”میں وقیع سے بمشکل تین سے چار بار وہ بھی سرسری طور پر ملی ہوں تو پھر یہ محبت کہاں سے بچ.....“

”محبت کے لیے ایک نگاہ ہی کافی ہوتی ہے۔“ وہ مزے سے اس کی بات کاٹ کر بولی تھی۔

”ہاں کہہ تو ایسے رہی ہو جیسے عشق میں PHD کی ہوئی ہو۔“ وہ تب کر بولی تھی جبکہ وہ ہنسنے لگی تھی اور وہ اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

”ہو گیا ہے تجھ کو تو پیار ریا! تو لاکھ کر لے انکار ریا.....“ وہ گنگنائی تھی اور راعیہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”پاگل ہو گئی ہے“ امو جان نے سن لیا تو.....“

خوف دامن گیر ہوا تھا۔

”پہلے تم میرے اندازے کو بچ یا جھوٹ ثابت کرو۔“ وہ مزے سے نکیہ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”سومی مجھے نہیں پتہ کہ یہ محبت و محبت کیا ہوتی ہے مگر جب میں نے وقیع احسن کو دیکھا ہے میری ایک ہارٹ بیٹ ضرور مس ہوئی ہے۔“ وہ بہت دھیرے سے بولی تھی۔

”وہی تو آج مہندی میں تم بار بار انہیں ہی دیکھے جا رہی تھیں اور جب وہ سامنے آئے تب تم نے کوئی بات ہی نہیں کی“ مجھے تمہاری خاموشی سے حیرانگی تو ہوئی تھی مگر تمہاری جھکی پلکیں بہت سے راز افشا کر گئیں۔“

”سومی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو اور جو تم محسوس کر سکتی ہو وہ اور کوئی بھی تو کر سکتا ہے وہاں کتنے ہی لوگ تھے سب میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔

”کوئی کچھ نہیں سوچے گا اور میں نے بھی اس لیے محسوس کیا کہ تمہیں بچپن سے جانتی ہوں۔“ سمید نے کہا تھا اور وہ فتنش کی ہی باتیں کرنے لگی تھیں اور ہر بات کی ٹانگ وقیع احسن پر آ کر ٹوٹتی تھی دروازے کے باہر کھڑی وہ جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے پلٹ بھی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”تسبیحہ! ایک منٹ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ سارہ کا آج ولیمہ تھا اس نے پہلے تسبیحہ کو ڈریسنگ روم میں کچھ منگوانے کو بھیجا تھا اور پھر پیچھے سے وقیع احسن کو بھیج دیا وہ اسے دیکھ کر پلٹی تھی مگر اس کی آواز پر ٹھم گئی تھی۔

”بیبا! میں آپ کو پسند کرنے لگا ہوں اس لیے اپنے پیرنس کو آپ کے گھر بھیجتا چاہتا ہوں۔“ وہ اسے کالی حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔

”آئی ریٹلی لو نو بیبا!“ وہ دھیسے سے مسکرایا تھا مگر کچھ ہی دیر میں اس کی مسکراہٹ سٹ گئی تھی۔

”آپ کا دماغ درست ہے جانتے بھی ہیں کیا کہہ رہے ہیں اور سخت برے لگتے ہیں مجھے یہ چھوڑنا انداز جسے دیکھو وہ محبت کیے جا رہا ہے محبت نہ ہو گئی مہنگائی ہو گئی جس میں آئے دن اضافہ ہی ہوا جا رہا ہے اسی طرح عاشقوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے ہر کوئی محبوں ہر کوئی عاشق..... عشق و عاشقی کے علاوہ آپ لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہے؟“ وہ تو ایک ہی سانس میں جانے کیا کچھ بول گئی تھی۔

”عشق نے نکلا کر دیا غالب ورنہ آدی تھے ہم بھی کام کے۔“ اس کی ناگواری اسے شرارت پر اکسار رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے واقعی آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے“ وقت پر اچھے ڈاکٹر کو دکھالیں۔“ وہ کہتے ہوئے جانے کو مڑی تھی مگر وقیع احسن اس کی کلائی تھام گیا تھا۔

”عشق کہتے ہیں جسے وہ خلل ہے دماغ کا۔“ وہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔

”ہوش میں رہ کر بات.....“ ہاتھ چھڑا کر چینی تھی۔

”آپ کو دیکھ لینے کے بعد کون ہوش میں رہ سکتا ہے۔“ اسے بات ادھوری چھوڑنے پر وہ مجبور کر گیا تھا۔

یہ طرز خطاب و انداز اس کی شخصیت کا خاصانہ تھے مگر تسبیحہ کے صبیح چہرے پر ناچتی ناگواری اسے شرارت پر اکسار رہی تھی جبکہ وہ ضبط کھونٹتی تھی اس لیے جومنہ میں آیا کہتی چلی گئی۔

”مسٹر وقیع احسن! میں بہت برداشت کر چکی آپ کو آپ کی نظروں اور گھٹیا باتوں کو اب تک میں صرف سارہ کا خیال رکھے ہوئے تھی مگر آپ مجھے کوئی ایکشن لینے پر مجبور کر رہے ہیں۔“ وہ بہت غصہ میں کہہ رہی تھی۔

”تسبیحہ آپ میرے جذبات.....“

”جذبات..... کسی لڑکی کو ہر وقت تاڑتے رہنا اور اسے اکیلا دیکھ کر اول فول کہنا..... آپ کے جذبات ہیں تو پلیز..... مجھے ایسے جذبات سے کوئی سروکار نہیں ہے آپ نے تو نگاہ کا زاویہ بناتے بھی یہ بھی نہیں سوچا کہ آپ کی یہ حرکت دو دوستوں کی دوستی میں دراڑ ڈال سکتی ہے مگر آپ یہ سب کیوں سوچنے لگے..... بس آپ کا ٹائم اچھا پاس ہو جائے اس سے بڑھ کر آپ کے لیے کچھ.....“

”تزاخ.....“ اس کی زبان کو بریک لگ گئے تھے۔

”تسبیحہ گیلانی! تم نے وقیع احسن کو بہت غلط سمجھا ہے تمہیں لگتا ہے کہ میں جسٹ ٹائم پاس کر رہا تھا ایسا ہوتا تو میں تمہیں فرینڈ شپ آفر کرتا پر پوز نہ کرتا میں تمہارے ساتھ فیئر تھا اور کون سی ڈکشنری میں لکھا ہے کہ محبت کا اظہار کرنا غلط.....“

”تہارے کتنے بچے ہیں اور یہ نیل بھائی کہاں ہیں؟“

”آفس سے نہیں لوٹے اور ہماری تین بیٹیاں ہیں سب سے بڑی والی کی دو ماہ قبل ہی نیل کے کسی جاننے والے کے توسط سے شادی ہوئی ہے“ تسبیحہ اور اس سے چھوٹی راعیہ سے خدا نے بیٹا.....“

”السلام علیکم!“ آواز پر چونک کر ان دونوں نے ہی دروازے کی جانب دیکھا تھا جہاں سمید کھڑا تھا۔

”نجمہ! ماشاء اللہ تمہارا بیٹا تو کافی خوبصورت اور نیل بھائی سے مشابہت رکھتا ہے۔“

”زشی! سمید میری نند کا بیٹا ہے۔“ انہوں نے بات کاٹ کر کہا تھا اور اسی وقت نفیسہ بانو کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

”ویری سوری بٹ مجھے لگا کہ یہ تمہارا بیٹا ہے کیونکہ نیل بھائی سے اس کی شکل کافی ملتی ہے۔“

”بی بی! اس میں حیرانگی والی کون سی بات ہے بچے باپ دادا پر جاتے ہیں یا خالہ ماموں پر اور سمید کسی غیر کا نہیں نیل کی سگی بہن کا بیٹا ہے۔“ نفیسہ بانو کے کہنے پر تازش کچھ شرمندہ ہو گئی تھیں۔

”سمید! ابھی سے کہاں چلے بیٹا چائے.....“

”ممائی جان! چائے پھر بھی سبھی اس وقت مجھے جلدی ہے“ سمید کا صبح پیر ہے اور میں راعیہ سے کتاب لینے آیا تھا“ تیاری تو اس نے کرنی ہے نہیں میں لیٹ ہو گیا تو سارا الزام مجھ معصوم پر آ جائے گا اس لیے اجازت دیجیے۔“ وہ خوشدلی سے کہتا باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

”ریا! مجھے لگتا ہے تجھے وقیع بھائی سے محبت ہو گئی ہے۔“ چوڑیاں اتارتی ہوئی راعیہ ٹھک گئی تھی۔

”انہیں دیکھ کر گرم صم ہو جانا“ چہرے پر حیا کی لالی پلکوں کا عارضوں کو چھونا“ سب محبت ہی کی تو علامتیں ہیں۔“ سمید اسے شرارت سے دیکھ رہی تھی جبکہ اس کا

چہرہ ابھو چھلکانے لگا تھا۔

”بکواس نہیں کر سومی! جودل میں آتا ہے کہہ دیتی ہے ایسا کچھ بھی نہیں ہے مجھی.....“ وہ جلدی سے کہتے ہوئے صبح کرنے چلی گئی تھی۔ آج سارہ کی مہندی تھی وہ لوگ کچھ دیر پہلے ہی وہاں سے لوٹی تھیں۔

”ریا! ویسے تو نے دل بھی چھانٹ کر زبردست بندے سے لگایا ہے جہاں سے ان کے ساتھ گزرا کرے گی لوگ غش غش.....“ اس کے آتے ہی سب نے سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا تھا راعیہ نے اسے نکیہ کھینچ کر مارا تھا اور وہ ہنسنے لگی تھی۔

”میں وقیع سے بمشکل تین سے چار بار وہ بھی سرسری طور پر ملی ہوں تو پھر یہ محبت کہاں سے بچ.....“

”محبت کے لیے ایک نگاہ ہی کافی ہوتی ہے۔“ وہ مزے سے اس کی بات کاٹ کر بولی تھی۔

”ہاں کہہ تو ایسے رہی ہو جیسے عشق میں PHD کی ہوئی ہو۔“ وہ تب کر بولی تھی جبکہ وہ ہنسنے لگی تھی اور وہ اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

”ہو گیا ہے تجھ کو تو پیار ریا! تو لاکھ کر لے انکار ریا.....“ وہ گنگنائی تھی اور راعیہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”پاگل ہو گئی ہے! امو جان نے سن لیا تو.....“

خوف دامن گیر ہوا تھا۔

”پہلے تم میرے اندازے کو بچ یا جھوٹ ثابت کرو۔“ وہ مزے سے نکیہ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”سومی مجھے نہیں پتہ کہ یہ محبت و محبت کیا ہوتی ہے مگر جب میں نے وقیع احسن کو دیکھا ہے میری ایک ہارٹ بیٹ ضرور مس ہوئی ہے۔“ وہ بہت دھیرے سے بولی تھی۔

”وہی تو آج مہندی میں تم بار بار انہیں ہی دیکھے جا رہی تھیں اور جب وہ سامنے آئے تب تم نے کوئی بات ہی نہیں کی“ مجھے تمہاری خاموشی سے حیرانگی تو ہوئی تھی مگر تمہاری جھکی پلکیں بہت سے راز افشا کر گئیں۔“

”سومی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو اور جو تم محسوس کر سکتی ہو وہ اور کوئی بھی تو کر سکتا ہے وہاں کتنے ہی لوگ تھے سب میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔

”کوئی کچھ نہیں سوچے گا اور میں نے بھی اس لیے محسوس کیا کہ تمہیں بچپن سے جانتی ہوں۔“ سمید نے کہا تھا اور وہ فتنش کی ہی باتیں کرنے لگی تھیں اور ہر بات کی ٹانگ وقیع احسن پر آ کر ٹوٹتی تھی دروازے کے باہر کھڑی وہ جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے پلٹ بھی گئی تھی۔

☆☆☆

”تسبیحہ! ایک منٹ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ سارہ کا آج ولیمہ تھا اس نے پہلے تسبیحہ کو ڈریسنگ روم میں کچھ منگوانے کو بھیجا تھا اور پھر پیچھے سے وقیع احسن کو بھیج دیا وہ اسے دیکھ کر پلٹی تھی مگر اس کی آواز پر ٹھم گئی تھی۔

”بیبا! میں آپ کو پسند کرنے لگا ہوں اس لیے اپنے پیرئس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔“ وہ اسے کالی حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔

”آئی ریٹلی لو نو بیبا!“ وہ دھیسے سے مسکرایا تھا مگر کچھ ہی دیر میں اس کی مسکراہٹ سٹ گئی تھی۔

”آپ کا دماغ درست ہے جانتے بھی ہیں کیا کہہ رہے ہیں اور سخت برے لگتے ہیں مجھے یہ چھوڑنا انداز جسے دیکھو وہ محبت کیے جا رہا ہے محبت نہ ہو گئی مہنگائی ہو گئی جس میں آئے دن اضافہ ہی ہوا جا رہا ہے اسی طرح عاشقوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے ہر کوئی محبوں ہر کوئی عاشق..... عشق و عاشقی کے علاوہ آپ لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہے؟“ وہ تو ایک ہی سانس میں جانے کیا کچھ بول گئی تھی۔

”عشق نے نکلا کر دیا غالب ورنہ آدی تھے ہم بھی کام کے۔“ اس کی ناگواری اسے شرارت پر اکسار رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے واقعی آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے“ وقت پر اچھے ڈاکٹر کو دکھالیں۔“ وہ کہتے ہوئے جانے کو مڑی تھی مگر وقیع احسن اس کی کلائی تھام گیا تھا۔

”عشق کہتے ہیں جسے وہ خلل ہے دماغ کا۔“ وہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔

”ہوش میں رہ کر بات.....“ ہاتھ چھڑا کر چینی تھی۔

”آپ کو دیکھ لینے کے بعد کون ہوش میں رہ سکتا ہے۔“ اسے بات ادھوری چھوڑنے پر وہ مجبور کر گیا تھا۔

یہ طرز خطاب و انداز اس کی شخصیت کا خاصانہ تھے مگر تسبیحہ کے صبح چہرے پر ناچتی ناگواری اسے شرارت پر اکسار رہی تھی جبکہ وہ ضبط کھو بیٹھی تھی اس لیے جومنہ میں آیا کہتی چلی گئی۔

”مسٹر وقیع احسن! میں بہت برداشت کر چکی آپ کو آپ کی نظروں اور گھٹیا باتوں کو اب تک میں صرف سارہ کا خیال رکھے ہوئے تھی مگر آپ مجھے کوئی ایکشن لینے پر مجبور کر رہے ہیں۔“ وہ بہت غصہ میں کہہ رہی تھی۔

”تسبیحہ آپ میرے جذبات.....“

”جذبات..... کسی لڑکی کو ہر وقت تاڑتے رہنا اور اسے اکیلا دیکھ کر اول فول کہنا..... آپ کے جذبات ہیں تو پلیز..... مجھے ایسے جذبات سے کوئی سروکار نہیں ہے آپ نے تو نگاہ کا زاویہ بناتے بھی یہ بھی نہیں سوچا کہ آپ کی یہ حرکت دو دوستوں کی دوستی میں دراڑ ڈال سکتی ہے مگر آپ یہ سب کیوں سوچنے لگے..... بس آپ کا ٹائم اچھا پاس ہو جائے اس سے بڑھ کر آپ کے لیے کچھ.....“

”تزاخ.....“ اس کی زبان کو بریک لگ گئے تھے۔

”تسبیحہ گیلانی! تم نے وقیع احسن کو بہت غلط سمجھا ہے تمہیں لگتا ہے کہ میں جسٹ ٹائم پاس کر رہا تھا ایسا ہوتا تو میں تمہیں فرینڈ شپ آفر کرتا پر پوز نہ کرتا میں تمہارے ساتھ فیئر تھا اور کون سی ڈکشنری میں لکھا ہے کہ محبت کا اظہار کرنا غلط.....“

”آپ عشق و عاشقی کے قصے ان کو سنائیں جن کو ان لغویات سے بچنی ہو اور بات اگر صرف پرپوزل کی ہے تو مجھے آپ سے شادی سے انکار ہے بات ختم۔“ وہ درشتی سے بولی تھی اور وہ چیئر کو ٹھوکر سے پرے دھکیلتا باہر نکل گیا تھا اور سارہ کی رخصتی تک وہ خود کو بمشکل کنٹرول کیے ہوئے تھا جبکہ بیاہر اور راعیہ کو لے کر گھر چلی گئی تھی جبکہ اسے سارہ نے رکنے کو بھی کہا تھا مگر وہ یہاں ایک بل کو بھی بھربنا نہیں چاہتی تھی اس لیے چلے جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔

☆☆☆

ظفر احسن کھڑکی میں کھڑے تھے اور ان کی نگاہ آسمان پر موجود چاند پر جمی ہوئی تھی اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

”کبھی میں نے بھی چاند کو پانے کی تمنا کی تھی مگر وہ چاند میرے لئے نہیں بنا تھا، اسے بچپن سے دیکھ کر اس کے سینے سجائے تھے وہ میرے نام سے منسوب بھی ہو گئی تھی مگر نہ مجھے اظہار کرنا آیا نہ میرے جذبے اس کے دل پر اثر انداز ہو سکے اور وہ بھی میری طرح محبت کے حصار میں بندھ گئی مگر اس کی نگاہ کا حصار میرے لئے نہ تھا، ہے نہ کتنی عجیب بات کہ جسے آپ برسوں سے چاہ رہے ہوں اور منزل بہت قریب ہو اور پھر بھی آپ تشنہ رہ جائیں۔“ وہ روشنی بکھیرتے چاند کو دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے تھے اور پردے برابر کرتے چلتے ہوئے راکنگ چیئر پر بیٹھ گئے تھے اور سگار سلگا لیا تھا، کش لگاتے ہوئے ان کا ذہن پھر ماضی کی جانب چلا گیا تھا۔

”جن آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنے کی تمنا برسوں سے دل کی دھرتی پر نمودار ہی تھی ان آنکھوں میں کسی اور کا عکس (اس شخص سے بھی پہلے) جس نے جگمگاتے دیکھا وہ میں تھا اور میں اپنی اندرونی کشش سے ہی لڑ رہا تھا کہ وہ ایک دن میرے پاس چلی آئی، جس کمرے میں پورے حق کے ساتھ میں اس کی موجودگی

تصور کرتا تھا وہ اسی کمرے میں مجھ سے کسی اور سے محبت کا اظہار کرتی مجھے ممکن توڑنے کا کہہ رہی تھی اور ظفر احسن نے تو ہمیشہ اس لڑکی کو صرف دیا ہی دیا تھا، جب وہ اس شخص کی محبت میں زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی تھی اسے وہ شخص بھی دے دیا، یہ سب اتنا آسان تو نہ تھا، لڑکے کی ماں کی مرضی کے خلاف شادی لڑکی والوں کی رضامندی، اپنے پیرنس کو سمجھانا..... میں نے یہ سب بہت مشکل سے ارجح کیا مگر مجھے اس کی مانگ اپنے دل کو کند چھری سے ذبح کرنے کے بعد بھی پوری کرنی تھی، اب تک تو میں خود ہی دونوں ہاتھوں سے لٹاتا آیا تھا اور جب اس نے خود اپنے منہ سے مجھ سے کچھ مانگا تھا (چاہے میری زندگی ہی سہی) مجھے تو اسے دینا ہی تھا، اسے کسی اور کو سونپ کر میں خوش نہیں تھا، بچپن کی محبت میرے اندر بین کر رہی تھی، نیندیں مجھ سے روٹھ گئیں تھیں، زندگی میں ایک خلاء سا آ گیا تھا مگر میں اسے خوش دیکھ کر مطمئن تھا مگر اسے کسی اور کے پہلو میں بیٹھے دیکھ کر میرے دل پر چھریاں سی چلتی تھیں اور میں اسے دعاؤں کے حوالے کرتا، اسے اس کی محبت سونپ کر وہ ملک ہی چھوڑ گیا کیونکہ مجھے اپنے اندر گر لاتی محبت کو بھی تو سلانا تھا جو اس کے سامنے رہتے ہوئے ناممکن تھا اور جو آج بھی ناممکن ہی ہے۔“ وہ خود ہی اپنی بے بسی پر متبسم تھے سوچتے سوچتے تھکنے لگے تھے اس لئے وہ کچھ دیر خود سے کچھ نہ بولے تھے مگر آج اندر کا درد اور یادیں باہر آنے کو بے تاب تھیں۔

ظفر احسن خالی الذہنی کے عالم میں راکنگ چیئر پر جھول رہے تھے اور پھر ان کے ذہن میں ماضی کی ریل سی چلنے لگی تھی اور وہ ایک بار پھر خود سے مخاطب تھے۔

”میرے پیرنس، میرے اس طرح جانے سے اداس تھے اور میں چاہ کر بھی ان کے لئے کچھ نہیں کر پا رہا تھا، میں خود سے لڑ رہا تھا، محبت کو بھولنے کی جھوٹی تمی کرنا تا کام ہو رہا تھا، کیونکہ بھولنے سے

محبت کبھی بھولتی نہیں ہے، اس کوشش میں وہ ہر روز میری یادوں میں مسکرانے لگی تھی اور زندگی شاید اس طرح گزرتی تھی مگر میری اکلونی بہن کی شادی طے ہو گئی اور میں لوٹ آیا، اور مجھے پتہ چلا وہ خوش نہیں ہے جن کی خوشیوں کی خاطر میں نے اپنی خوشیاں تیاگ دی تھیں، ان کے متعلق ایسا سن کر میں تڑپ اٹھا تھا، اور بہن سے سبب معلوم کیا تو پتہ چلا وہ اپنے گھر میں مقید ہو گئی ہے رشتہ داروں سے ملنا تو بعد وہ اپنے پیرنس سے نہیں مل سکتی، اور میں جانتا تھا کہ وہ اپنے بابا کی کتنی لاڈلی تھی اور ماں کی کتنی چپیتی تھی اور اس دن میں پہلی دفعہ اس کے گھر گیا تھا، اسے دیکھنے نہیں بلکہ اسے اس کے بابا کا آخری دیدار کروانے کے لئے لانے مگر اس کا شوہر گھر میں نہیں تھا اور ساس نے جانے کی اجازت دی تھی، مگر ہمیشہ جانے کی اس کے اٹھتے قدم تھم گئے تھے، جس لڑکی کی آنکھ میں آنسو نہ لانے کی وجہ سے میں نے خود دکھوں سے دوستی کر لی تھی، وہ اپنی ساس کے قدموں میں جھکی تڑپ رہی تھی، اور میرے اندر کی خوش فہمیاں کہ وہ بہت خوش ہے، مجھ پر ہنسنے لگی تھیں، اور میں نامراد ہی اسے تڑپتا چھوڑ، واپس لوٹنے پر مجبور ہو گیا تھا، کیونکہ اس کی ساس نے میری ریکویسٹ کو غلط معنی پہنا نا شروع کر دیے تھے، بات اس کے کردار پر آنے لگی تو میں نے اس کی دہلیز پار کرنے میں لمحہ نہیں لگایا تھا۔“ وہ دن پوری آب و تاب سے ان کی آنکھوں میں جگمگانے لگا تھا، اور وہ بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگے تھے۔

”اس دن میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا، ہمارا کبھی سامنا نہیں ہوا، میں نے اپنے پیرنس کی شادی کر لی اور پیرنس کی آگے پیچھے اتار کے بعد امریکا شفٹ ہو گیا، خدا کو شاید میرا امتحان مقصد نہ تھا، اس لئے بیوی میری کسی نعمت نہ تھی، اس نے محبت توجہ نیک صالح اولاد سب

ہی کچھ مجھے دیا، اور میں نے بھی خود کو صرف اسی کے لئے وقف کر دیا، بس، محبت کی بے اختیاری نہ دے سکا رشتہ قائم رکھنے کے لئے جس محبت اور اپنے پیرن کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہمارے درمیان موجود تھی، بچے بڑے ہونے لگے تو پاکستان شفٹ ہو گئے مگر میں زیادہ تر امریکا میں ہی رہتا تھا، بیٹی کی شادی، بہن کے بیٹے سے طے کر دی اور خود بھی مستقل طور پر پاکستان شفٹ ہو گیا، اپنا بزنس سیٹ کیا، بیٹے نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری لی اور بزنس میں میرا ہاتھ بٹانے لگا۔ زندگی کافی سہل گزر رہی تھی، میں نے بھول کر بھی کبھی ان جانے پہچانے راستوں کا سفر نہیں کیا تھا، کیونکہ میں نے ماضی میں جینا چھوڑ دیا تھا، مگر میری بیٹی کی مہندی میں میرا ماضی میرے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔“ وہ چلتے چلتے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئے تھے ایک بار پھر سگار سلگا لیا تھا اور کمرے میں دھواں پھیلنے لگا تھا اور اس دھوئیں میں ایک عکس ابھرنے لگا تھا۔

”دھانی رنگ کے لباس میں بلاشبہ وہ وہی تھی وہی گلابی رنگت، بڑی بڑی آنکھوں پر پہرہ دیتیں سادہ گھنیری پلکیں بائیں گال پر کالا تل اور بات کرنے کا وہی انداز..... وہ میرے بیٹے سے کھڑی بات کر رہی تھی کچھ دیر بعد وہ مجھے سلام کرنے آئی تھی اور جس انداز میں اس کی ماں مجھے پکارا کرتی تھی وہی انداز بھی اسے اپنایا تھا، میں نے دل سے دعا کی تھی کہ میرا اس کی ماں سے سامنا نہ ہو، اسے پانے کی دعا تو قبول نہ ہوئی تھی مگر یہ قبول ہو گئی تھی، وہ ناساز طبیعت کی وجہ سے نہیں آئی تھیں، برات میں، میں اس کا نامحسوس طریقے سے منتظر تھا مگر وہ ولیمہ میں آئی تھی، سرخ چہرے اور جھکی پلکوں کے ساتھ وہ میرے بیٹے کے سامنے کھڑی تھی، وہ دونوں ایک ساتھ کھڑے مجھے بڑے اچھے لگے تھے، میں چلتے ہوئے ان کے پاس آ رہا تھا، اور اسے بات کرنے کے درمیان جو بات جو مجھے قابل گرفت لگی تھی

وہ اس کی غزالی آنکھوں میں بھٹی جھٹ جھٹی جس طرح اس کی ماں کی آنکھوں کی تحریر میں نے پڑھ لی تھی اس کی آنکھوں کی تحریر بھی جان گیا تھا۔ شدید محبت شاید اسی کو کہتے ہیں! میں نے کچھ دیر قبول ہی اپنے بچے سے شادی کی بات کی تھی اسے میری پسند پر حیرانگی تھی اور اسے صاف منع کر دیا مجھے میرا بیٹا کافی دگنی لگا کافی دن سے وہ مجھے پہنچ لگ رہا تھا اور آج رات کھلا کہ وہ باپ کی طرح محبت کا مسافر ہے! میں اپنی محبت نہیں پاسکا تھا مگر کوشش کروں گا کہ میرے بچے کو اس کی محبت ضرور ملے! میں نے اس کی ماں کو تو اس کی محبت سوچ دی تھی کیونکہ اعتبار کی ڈوری میرے ہاتھ میں تھی لیکن اب اسے اس کی محبت چاہ کر بھی نہیں دے سکتا کیونکہ میں اپنے بچے کو مجبور نہیں کر سکتا اور اس کی خوشی مجھے بہت عزیز ہے! لیکن جس طرح میں اس کی ماں کے لئے دعا نہیں کرتا آیا ہوں آج وہ بھی میری دعاؤں میں شامل ہوگئی ہے! اور اللہ نے اس کی ماں کے لئے مانگی ہر ایک دعا کو نامراد لوٹا یا ہے چاہے وہ اس کے ساتھ کی دعا ہو یا اس کی خوشیوں کی..... شاید اس کے لئے مانگی دعائیں قبول ہو جائیں اور جس شخص سے بھی اس کی شادی ہو وہ اسے عزت اور پاہت کا ایک جہان دے! آمین۔" ظفر اسن نے دل سے آمین کہا تھا اور سارے بچا کر سونے کے لئے لیٹ گئے تھے وہ بہت کچھ کھو کر بھی مطمئن تھے کیونکہ انہوں نے صرف کھوپڑی نہیں تھا بہت کچھ پایا بھی تھا اور وہ تو کم پر بھی ہر حال میں شکر ادا کرنے والوں میں سے تھے اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں یہی بہت اچھی ملی تھی۔

☆☆☆

"یہاں تم کسی ایک شخص کی وجہ سے تمام محبت کرنے والوں کو برا اور بددعا خلاف نہیں کہہ سکتیں اور اگر تمہاری ہی بات بڑی رکھو تو میرے بھیا جانی! کون سا تم سے ٹکڑے کر دے تھے شادی ہی تو کرنا چاہتے۔"

"سارہ! میں کسی کو لے لنگڑے! پانچ شخص سے

شادی کر سکتی ہوں! مگر اسے نہیں جو مجھ سے محبت کا دھجہ دار ہو! اور تمہارے بھائی صاحب جیسا کہ تم نے کہا وہ سچے ہیں! محبت اول تو ہوتی نہیں ہے! دم تا حیات قائم نہیں رہتی! اس لئے میری طرف سے مطریت میری شادی میرے گھر والوں کی مرضی سے ہوگی اور وہ شخص کم از کم وہ ہوگا جو مجھ سے محبت کا دھجہ دار نہ ہوگا۔" اس نے جیسے قہقہہ ختم کر دیا تھا۔

"یہاں تم محبت کی طاقت کرتی ہو مگر یہ کائنات کی محبت کی کارستانی ہے! انسان محبت کے بغیر جی ہی نہیں سکتا! ہر رشتہ ہی محبت کا متقاضی ہوتا ہے! میں جائز محبتوں کی کاکل ہوں! ماں بیٹی سے! بہن بھائی سے! شوہر بیوی سے! محبت کرتی ہے! اگر دشمنوں میں محبت نہ ہو تو وہ بے روح رشتے زیادہ دن پہنچ نہیں پاتے! اسی طرح اگر کوئی لڑکی شادی سے پہلے سے محبت کرتی ہے اور اس کی شادی ہو جاتی ہے تو اس میں بھی محبت نہیں کھنکھاتی کہ کوئی برائی ہے! اور یہاں کل تم بھی کسی شخص کی محبت میں گرفتار ہوگئی چاہے وہ تمہارا شوہر ہی کیوں نہ ہو! محبت کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔" وہ دوست کو سمجھانے کی کوشش میں تھی۔

"یہاں عورت کی زندگی تو جوئے کی مانند ہوتی ہے جس میں جیت اس کا مقدور شاد و نار ہی بنتی ہے! عورت ساری زندگی رشتوں کو محبت سے باندھے رکھنے میں لگی رہتی ہے! پھر بھی اس کے ہاتھ خالی رہتے ہیں۔

یہاں زندگی میں بہترین مواقع قسمت سے ملتے ہیں جس شخص سے تمہاری شادی ہوگی وہ تمہارے بھیا جانی کی طرح ہوا تو تم کیا کر لوگی.....؟ محبت ٹکڑا کر بچکانے سے بھرتے! محبت کو پا کر بچھتا لیا جائے! میں تمہیں بددعا نہیں دے رہی! اور نہ ہی اپنے بھائی کی حمایت کر رہی ہوں! میں تمہاری دوست ہوں! اور میری دعا تو یہی ہے کہ تم جہاں بھی جس کے بھی ساتھ رہو بہت خوش رہو۔ وہ اس کے کان سے پر ہاتھ سے دبا ڈالا! ہاں ہر نگل ملی تھی۔

☆☆☆

"تم نہیں جانتیں سارہ! میں نے محبت کا کیسا بھیا تک روپ دیکھا ہے! تم نے ٹھیک کہا ہے کہ محبت ہر رشتے کی بنیاد ہوتی ہے! مگر میں کسی بھی مرد کی محبت یقین نہیں کر سکتی اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میر جس شخص سے شادی کروں گی وہ مجھ سے محبت کا دھجہ دار نہ ہوگا۔" اس نے دل ہی دل میں سارہ کو مخاطب کر کے کہا تھا اور بے صبر بے چند آنسو پور پر سمیٹ لئے تھے۔

☆☆☆

"ڈیز ڈائری! یہ زندگی بھی انسان کے ساتھ کیسے کیسے مذاق کرتی ہے! میں نے زندگی میں پہلی دفعہ کسی کا ساتھ چاہا! مگر وہ میری ٹیلنگو سمجھ ہی نہ سکی اور مجھے بے بردی سے ٹھکرا دیا! میں اس سوگ کو ہی نہیں منا پا رہا تھا کہ میرے بابا نے اسی لڑکی کی بہن سے میری شادی کی

بات ہے! تم خود پتاؤ میں انکار نہ کرتا تو کیا کرتا.....؟ میری بہن! کچھ دیر قبل کہہ کر گئی ہے کہ وہ بھی اور بابا جان سے شادی کی بات کرے گی! جس لڑکی نے میری عزت نفس مجروح کی! وہ اسی سے شادی کی بات کروانے کا کہہ گئی ہے! اور میں بہن کو روک بھی نہیں سکا جبکہ دماغ رد کرنے کو کہہ رہا تھا! مگر دل..... لیکن میں یہ نہیں چاہوں گا کہ بار بار میری عزت نفس مجروح ہو! اس لئے میں بہن کو روک دوں گا۔" اس نے دل مضبوط کر کے فیصلہ لیا تھا اور قلم رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

”بیا! پلیز چلے نہ اموجان! مجھے اکیلے کبھی نہیں جانے دیں گی اور میں سمیہ کو پھپھو کے گھر جا کر وٹ کرنا چاہتی ہوں۔“ سمیہ کی برتھ ڈے تھی اور راعیہ جانے پر بضد تھی جبکہ وہ جانا ہی نہیں چاہتی تھی اسے اپنی پھپھو بالکل پسند نہیں تھیں اسے دو غلے اور غانا باز ٹائپ کے لوگ پسند نہ تھے جبکہ اس کی دادی پھپھو کچھ اس طرح کی تھیں۔

”دیا اور بیا! دونوں جا کر تیار ہو جاؤ“ میں تم لوگوں کے ساتھ چل رہی ہوں۔“ وہ ایک دوسرے سے الجھتی نفیسہ بانو کی آواز پر ان کی جانب متوجہ ہو گئیں تھیں۔

”او..... تھینک یو دادو!“ وہ جوش سے کہتی اپنے روم میں چلی گئی تھی وہ ایسی ہی تھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے اور کسی کی بڑی سے بڑی غلطی کو معاف کر دینے والی اس کے برعکس بیا کو دادی کی مداخلت اور بہن کا جوش دونوں ہی اک آنکھ نہ بھائے تھے۔ اور اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

”مجھے بن بڈائے کسی کے بھی گھر جانے کا مرض لاحق نہیں ہے“ آپ کو جانا ہے تو ریا کے ساتھ چلی جائیں بے چاری آپ کی دریا دلی پر ویسے ہی خوش ہو گئی ہے۔“ وہ بہت غلطی سے کہہ رہی تھی۔

”بیا! تم تیز بالکل بھولتی جا رہی ہو بزرگوں سے بات کرنے کا یہ کونسا طریقہ ہے.....؟ میں نوٹ کر رہی ہوں تم دن بدن اپنی دادی سے بدتمیزی سے.....“

”اس میں میرا قصور نہیں ہے میں نے تو اپنی دادی ماں سے جو جیسا سیکھا ہے ویسا ہی لوٹا رہی ہوں بچے تو ویسے بھی وہی کرتے ہیں جو ان کے بڑے انہیں سکھاتے ہیں اور میں نے اپنی دادی سے چرب زبانی و بدزبانی.....“

”بس..... بیا! چپ ہو جاؤ“ کیسی کینچی کی طرح چل رہی ہے تمہاری زبان یہی کی ہے میں نے تمہاری پروزش کہ تم یوں دادی کو پٹ پٹ جواب دو میں نے

کبھی اپنے بڑوں سے زبان درازی نہیں کی چاہوں گی کہ میری اولاد میرے نقش قدم پر ہوئے بڑوں کا احترام کرے۔“ نجمہ کافی تیز لہجے سرزنش کر رہی تھیں۔

”اموجان! آپ کی چچی میں احترام نہیں، کم جھلکتی ہے“ ظالم کو ظالم بنانے میں مظلوم کا ہی ہوتا ہے وہ یہ سوچ کر خاموشی سے ظلم سے جاتا ہے ایک دن اسے اس کے کئے کا اور صبر کا پھل ضرور ملے گا، مگر اموجان! جب آدمی سے زیادہ غم ظلم کی پیٹے پیٹے گزر جاتی ہے تو زندگی کی آخری شام والا معافی نامہ اور تعریفی سند کس کام کی.....؟

آپ بھی اگر مناسب حد تک دادی کو ان کا برابر لوٹائیں تو آج نہ میرے دل میں دادی کے لئے نفرت ہوتی اور نہ آپ کے لئے ترحم ہی ہوتا، آپ کی خاموشی نے کیا دیا، آپ کو دادی کے کوسنے پپا کی زاری بیٹیوں کی باپ سے دوری اور اس گھر میں کہنے کو آپ کا بھی ہے آدھا ادھر اسحاق اور اپنا اس کے علاوہ تو آپ کی خاموشی نے آپ کو کچھ نہ دیا اور جب اپنے زندگی کے حسین لمحے پپا کی محبت میں ان کا انتظار کرتے گزار دیئے تو ان کا لوفٹا آپ کے کس کام کا.....؟ کیا آپ کی وہ ننھی سی خوشیاں، سہانے خواب، چاہت سے لبریز انہیں سے کچھ بھی مل سکتا ہے آپ کو.....؟ جب وقت لوٹ ہی نہیں سکتا تو کیوں ہم کسی کو خود پر کرنے کا موقع دیں۔“ سمیہ کافی غصے سے سچائی پر کر رہی تھی، نفیسہ گیلانی تو ششدر سی بنی کا چہرہ جاری تھیں جبکہ وہ اپنے اند آنے والے آنسوؤں بے دردی سے اپنے ہاتھ کی پشت سے رگڑتی لڑا سے گزر کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی، نفیسہ با کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہی تھیں مگر بیٹے کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح پینتر ابدل گئی تھیں۔

”بیا! مجھے رضو کے گھر چھوڑ آ“ بیا! اپنے ہی

کے گھر میں پر اپوں کی طرح میں نہیں رہ سکتی۔“ وہ بے مصنوعی آنسو پونچھنے لگی تھی۔

”اماں! ایسا کیا کہہ دیا ہے آپ کو کسی نے جو آپ چھوڑ کر جانا چاہتی ہیں.....؟“ آفس سے لوٹے گیلانی اپنی تھکن بھول کر ماں کی دل جوئی میں لگے تھے۔

”مجھ بڈھی کو کوئی کہے گا تو کچھ اس وقت جب سمجھے گا میں تو اس گھر میں بوجھ بن کر رہ گئی ہوں تو رضو کے گھر چھوڑ آ“ اگر بیٹی داماد نے بھی مجھ بڈھی نہ رکھا تو“ ایدھی سینئر چلی جاؤں گی شاید مجھ بے مارا کو وہاں آسرا مل جائے۔“ نفیسہ بانو کی بردست اداکاری دیکھ کر نجمہ گیلانی اپنے آنسو بھول رہیں تھیں۔

”اماں! ابھی زندہ ہوں میں اور میری ماں مجھ پر جھ نہیں ہے آپ کیوں ایسا سوچتی ہیں.....؟“ وہ ماں چہرہ ہاتھوں میں تھام کر بڑے ادب اور دل گرفتگی سے کہہ رہے تھے۔

”میری عمر بھی تجھے لگ جائے میں تو بس تجھے اور سو کو ہی تو دیکھ کر جیتی ہوں، مگر مجھ سے اب اپنی بے عزتی بردا.....“

”اماں! کس نے کی ہے آپ کی بے عزتی، ایک اس کا نام بتائیں زندہ نہیں چھوڑوں گا.....“

”تو غصہ نہ کر میرے چاند، پتی ہے کبھی کبھی زبان درازی کر لیتی ہے بس آج زیادہ ہو گیا تو میری منت جواب دے گی، جو مجھے تجھ سے بھی زیادہ عزیز ہے اس کی بدتمیزی دل کا خون کر دیتی ہے اولاد کو اس لئے تو بڑا نہیں کرتے کہ وہ جوان ہو کر بوڑھے باپ ادا سے دو بدو لڑائی کرنے لگیں اور میں بے توپیا سے ایسا کچھ کہا بھی نہیں تھا میں تو نجمہ سے بیا اور جمشید کے رشتے کی بات کر رہی تھی اور دونوں ماں بیٹی بھڑک چھیں اور مجھے گالی کو سننے.....“ وہ آگے بھی روتے ہوئے بیٹے کو جانے کیا کہانی سنار ہی نہیں مگر نجمہ گیلانی

تو بیا اور جمشید کی شادی پر ہی ایک انگ گئی تھیں، اول تو ان کے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی، دوم وہ کس طرح ایک باہل شخص کا ان کی پڑھی لکھی خوبصورت بیٹی کے رشتہ کی بات کر سکتی تھیں۔

”بیا! بیا۔“ وہ ماں کی بات کے درمیان با آواز بلند گرجدار انداز میں اسے پکار رہے تھے وہ جلدی سے اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی تھی۔

”چناغ..... چناغ.....“ انہوں نے اسے دیکھتے ہی بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا تھا اور دو طمانچے لگا کر اس کے گال پر مارے تھے وہ لڑکھڑا کر نیچے گری تھی، نجمہ گیلانی جلدی سے تڑپ کر آگے بڑھی تھیں۔

”نبیل! کیا ہو گیا ہے آپ کو بیٹی پر ہاتھ.....؟“ وہ بلکتی ہوئی بیاہ کو اٹھا کر میاں سے بولی تھیں مگر نبیل گیلانی نے ان کی بات کو تکمیل کے مراحل تک پہنچنے نہیں دیا تھا۔

”تم اماں بیٹی کیا سمجھتی ہو کہ میں مر گیا ہوں جو من مانیوں پر اتر آئی ہو یہ میرا گھر ہے نجمہ بیگم اور یہاں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا تم نے کس سے پوچھ کر میری ماں سے بدتمیزی کی اور میرے علم میں لائے بغیر کیسے اس رشتے سے انکار کیا؟ تم دونوں ابھی اتنی بااختیار نہیں ہوئی ہو بیا کی شادی وہیں ہوگی جہاں میں چاہوں گا اور مجھے تم دونوں کے انکار یا اقرار سے کوئی مطلب نہیں ہے بیاہ کی شادی جمشید سے ہی ہوگی۔“ نفیسہ بانو کے دل کی نکلی کھل گئی تھی اور ان تینوں کے سروں پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

”نبیل صاحب! جس بیٹی کو منحوس کہہ کر اسے گود میں اٹھانا گوارا نہیں کیا تھا، اس کا بچپن کب محرومیوں کے ساتھ گزرا، کب باپ کے ہوتے ہوئے بھی اس نے شفقت سے محروم جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا، آپ لاعلم رہے اور آج اس کی شادی کا فیصلہ کرنے کا وقت آیا

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

تو آپ اس کے سر پرست بن گئے۔ نجمہ گیلانی بہت غصے سے جواب طلب کر رہی تھیں اور نیل گیلانی تو ہر وقت خاموش اور دھیمے لہجے میں ضروری بات کرنے والی بیوی کو غصہ میں تیز لہجہ میں بات کرتے دیکھ حیران رہ گئے تھے اور یہی حال ساس کا بھی تھا۔

”میری بیٹی کو ایسی سرپرستی کی ضرورت نہیں ہے نیل صاحب! جو اسے اس کی خوشیاں چھین لے آپ اس کے وجود سے بے خبری رہیں تو اچھا ہے اس طرح کم از کم ایک پاگل شخص کو.....“

”بہو!.....“ نفیسہ بانو نے انہیں لوکا تھا۔
”واہ! اماں! واہ! پاگل نواسے کا اتنا درد ہے کہ سچائی حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تو یہ میری بیٹی بھی تو آپ کی کچھ لگتی ہے پوتی کے بارے میں نہیں تو اپنے بیٹے کا ہی خیال کیا ہوتا ساری زندگی بیٹی کو ہی دیتی آئی ہیں کبھی بیٹے کو بھی.....“

”بہو! اس میں اتنا بگڑنے والی کوئی بات ہے اور جمشید پاگل نہیں ہے یہ تو تم خود بھی جانتی ہو۔“ نفیسہ بانو ان کی بات کاٹ کر درشتگی سے بولی تھیں۔

”میں جانتی ہوں آپ کا نواسا پاگل نہیں ہے مگر نارمل بھی تو نہیں ہے 24 برس کا ہو جانے کے باوجود وہ ابھی تک 13، 14 سال کا بچہ ہے اس کی دماغی حالت نارمل نہیں ہے اور آپ کو میری بیٹی کے لئے ایک ایسا نارمل شخص ہی ملتا تھا اسے بہتر تو یہ ہے کہ اپنی بیٹی کو کنوارہ ہی رکھوں ایک آدھا ادھورا انسان جس کو شادی تک کا مطلب نہیں ہے وہ آخر میری بیٹی کو کیا دے گا.....؟“ وہ بہت غصہ میں تھیں۔

”جمشید کی حالت حادثہ کا نتیجہ ہے اور ڈاکٹر ز کے مطابق شادی کے بعد اس میں بہتری ممکن ہے اور بہو تم تو فضول میں غصہ کرنے لگیں میں کون سا زبردستی تمہاری بیٹی کا نکاح پڑھوانے لگی تھیں اور جب نیل کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو تم کون ہوتی ہو اعتراض کرنے والی.....؟“ وہ بھی بہت غصہ میں آ گئی تھیں کیونکہ نجمہ

گیلانی کے داویلے اور بیٹے کی خاموشی نے انہیں اپنے مقصد میں کامیابی کے چانسز کم ہونے کا خاطر خواہ احساس دلایا تھا۔

”ماں! ہوں میں اس کی..... اور اس کی شادی کا فیصلہ لینے کا مجھے پورا حق حاصل ہے۔“ وہ تڑک کر بولی تھیں اور وہ دونوں اپنی دھیمے لہجے میں بولنے والی ماں کو کافی حیرانگی سے دیکھ رہی تھیں۔

”دیکھا تو نے؟“ نیل! آج تو تو نے اپنے کانوں سے سن لی بیوی کی بکواس اور آنکھوں سے دیکھ لی ماں کی بے عزتی..... یہ عزت ہے میری اس گھر میں نہ پوتیاں کچھ سمجھتی ہیں اور نہ بہو.....“ وہ اپنے ملل کے سفید دوپٹے میں مصنوعی آنسو جذب کرنے لگی تھیں۔

”اماں! اساری زندگی آپ نے مگر مجھ کے آنسو اور جھوٹے داویلے ہی تو کرتے ہوئے گزاری ہے مگر میں اس بار کمزور نہیں پڑوں گی اور نہ آپ کو آپ کے گھٹیا عزائم میں کامیاب ہونے دوں گی! میری بیا کی شادی ہرگز بھی آپ کے پاگل نواسے سے نہیں ہوگی۔“

”نجمہ..... میری ماں کی توہین کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے اور بیا کی شادی کا فیصلہ تم نہیں کروں گا! اور اس کی شادی جمشید سے نہیں کسی اور سے میں.....“

”پاپا جانی! مجھے اس رشتے سے کوئی انکار نہیں ہے! داوی ماں! اسی وقت یا آپ جب چاہیں میں آپ کے نواسے سے نکاح.....“

”بیا! پاگل ہو گئی ہو جانتی بھی ہو.....“ وہ بے یقین تھیں۔

”امو جان! جب مجھے اعتراض نہیں ہے تو آپ کا انکار کوئی معنی نہیں رکھتا۔“ وہ اپنے مخصوص کاٹ دار لہجے میں بولی تھی جبکہ وہ بیٹی کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆
”داوی ماں! بہتر تو یہی ہوگا کہ آپ ابھی اور اسی

وقت قاضی بلوالیس! بعد میں امو جان کی وجہ سے پپا جانی کا بھی ارادہ بدل بھی سکتا ہے۔“ وہ ان کے کان میں سمجھتے ہوئے سرگوشی میں بولی تھی اور وہ ششدری اسے دیکھنے لگی تھیں۔

”بکواس! بند کرو بھلا اور اپنے کمرے میں جاؤ۔“ انہوں نے بیٹی کو گھورتے ہوئے جانے کو کہا تھا جبکہ نیل گیلانی آج اتنے برسوں میں پہلی دفعہ کچھ قاصلے پر موجود بیٹی کو بغور دیکھنے لگے تھے خوبصورت گلابی چہرہ! داہنا گال انگلیوں کے نشان لئے ہوئے کافی زیادہ سرخ ہو رہا تھا! سیاہ بڑی بڑی روشن آنکھیں! جن میں کمی و تسخر ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے انہیں وہ اپنا ہی پرتو لگتی تھی۔

”نیل! اگر تو کہے تو میں رضیہ اور قاضی.....“ ان دونوں میاں بیوی نے یکدم انہیں دیکھا تھا! نیل کی آنکھوں میں تحیر اٹھ آئی تھا جبکہ نجمہ گیلانی سوچ رہی تھیں کہ کتنی بے حس عورت ہے جسے صرف اپنی انا کی تکمیل کرنا بھی اس کے لئے چاہے کسی معصوم کی زندگی ہی کیوں نہ برباد ہو جاتی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے اماں! کیونکہ بیا کی شادی جمشید سے نہیں.....“

”مجھے اس شادی پر اعتراض نہیں ہے! اس لئے داوی ماں جو کر رہی ہیں ان کو کر لینے دیجئے۔“ وہ نیل گیلانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بے خوف لہجے میں کہتی باہر نکل گئی تھی اور وہ بھی جانے کیوں دکھ کی کھائی میں غوطہ زن ہوتے جھکے کاندھوں سے اپنے روم میں چلے گئے تھے۔

نفیسہ بانو نے نجمہ گیلانی کے آنسوؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بیٹی کو نون کیا تھا۔

”اماں! اس سب سے آپ کو کیا ملے گا.....؟ میں تو چلیں آپ کی دشمن ہوں مگر نیل تو آپ کی سگی

اولاد.....“
”نہیں ہے وہ میرا بیٹا.....“ انہوں نے دھماکا

کیا تھا۔

”یہ آپ.....“ مارے حیرت کے زبان گنگ ہو گئی تھی۔

”ابھی وقت نہیں ہے! قاضی کے اور اراق پلٹنے کا رضو قاضی صاحب کو لے کر آتی ہی ہوگی! بیٹی کو سرخ جوڑا پہنانا ہے تو پہناؤ! اور میرا تم سے وعدہ رہا! نجمہ کہ یہ میرا آخری وار ہے! اس کے بعد تم میری ہر نفرت سے آزاد ہوگی۔“ وہ حقارت سے بولی تھیں۔

”اماں! ابھی آپ نے شاید سنا نہیں تھا! نیل اس شادی.....“

”نیل! کو رضی کرنا اس کی ماں کا کام ہے تو اپنا کام کر۔“ انہوں نے نجمہ گیلانی کو پرے دھکیلا تھا اور صوفیے پر بیٹھ گئی تھیں کچھ ہی دیر میں قدموں کی آواز ابھری تھی رضیہ بانو کے ساتھ جمشید تالیاں بجاتا ہوا اور قاضی صاحب کے ساتھ چار مرد اور تین عورتیں بھی تھیں۔

”میں یہ نکاح ہرگز نہیں ہونے دوں گی! نیل اگر آپ نے اپنی ماں کو نہیں روکا تو.....“

”اماں!..... آپ کو یہ سب اتنی جلدی کرنے کی کیا ضرورت تھی! ہم بیا کی شادی جمشید سے نہیں کر سکتے۔“ شوہر کی بات پر نجمہ گیلانی کے کچھ ڈھارس بندھ گئی تھی۔

”تیرے اور تیری بیٹی کے قرار پر ہی میں نے رضو کو بلایا.....“

”واپس بھی بھیجا جاسکتا ہے۔“ یہ نجمہ گیلانی تھیں۔

”ایسے کیسے واپس بھیجا جاسکتا ہے! مہمانوں کے سامنے ہماری ناک کٹ جائے گی اور نبیلو تو نے اب انکار کیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔“ نفیسہ بانو نے ان کی سماعتوں میں زہر گھولا تھا۔

”اماں.....“

”رہنے دے بس! اب فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے اور تو اپنی ماں کو تو جانتا ہی ہے! جس نے صرف اپنی اونچی

ناک کے لئے اپنے گئے بہن بھائیوں کو مرتے دم تک کے لئے چھوڑ دیا وہ اپنی عزت کی خاطر جان دینے سے دریغ نہ کرے گی۔ وہ سن فن کرتیں باہر نکلے کوئیں ان کی بیٹی روم میں داخل ہوئی، نیل گیلانی تشکیش میں تھے ایک جانب ماں اور اس کی ضدھی تو دوسری طرف بیٹی کی زندگی اور بیوی کی فریادیں تھیں۔

”واوی ماں! آپ کو کوئی دھسکی دینے کی ضرورت نہ تھی جبکہ میں اس شادی.....“

”تراخ.....“ نجمہ گیلانی کو وہ حیرت سے کہنے لگی تھی۔

”میں ابھی تیری ماں زندہ ہوں مری نہیں ہوں جو تو اس طرح ایک ابنارمل سے شاد.....“

”امو جان! میں نے بچپن سے آج تک ایک ابنارمل زندگی ہی تو گزاری ہے اور پیا جانی جیسے شخص کی بیوی بننے سے تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ میں ایک ابنارمل شخص سے ہی شادی کر لوں ہم سب ابنارمل ہیں آپ جسے ساری زندگی خاموشی سے گزار دی، وادی ماں جنہوں نے ظلم کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی پیا جانی جنہوں نے گھر کو اکھاڑا بنا دیا میں نے تو بھی نازل زندگی گزاری ہی نہیں ہے کہ نازل لوگ کیسے ہوتے ہیں ہم سب ابنارمل ہیں تو جمشید سے شادی کرنے سے کونسا فرق پڑے گا وہ کم از کم مجھے پیا جانی کی طرح منحوس نہیں کہے گا صبح و شام میری بے عزتی نہیں کرے گا آپ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں نا تو پلیز..... یہ شادی ہو جانے دیجئے۔“ وہ ان کے ہاتھ تھامے التجا کر رہی تھی وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

”نہیں..... پیا میں..... کیسے.....“ وہ تڑپ رہی تھیں۔

”پلیز..... امو جان..... پلیز..... آپ کو خدا کا واسطہ مجھے.....“ وہ اسے سینے سے لگا کر ہلکے آغوش میں نیل گیلانی کے تو قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

اور وہ بہت تڑپ کر بیٹی کی جانب بڑھے تھے مگر بچپن سے جس طرح وہ ان کے بڑھے ننھے ننھے ہاتھوں کو جھڑکتے آئے تھے آج وہ ان کے ہاتھ جھڑک کر دور کھڑی ہو گئی تھی اور وہ ساکت نظروں سے بیٹی کو دیکھنے لگے تھے اور ان کی عظیم ماں نے اپنے اندر کے انتقام کو جلا بخشنے کے لئے بے بسی کی انتہا کرتے ہوئے پوتی کا نکاح ایک پاگل شخص سے کروا دیا تھا اور خود انہوں نے بیٹی کے سر پرست کی حیثیت سے نکاح نامے پر دستخط کر دیئے تھے تسبیح کچھ ہی لمحوں میں تسبیح جمشید بن گئی تھی نفیسہ بانو نے تسخر سے بہو کی جانب چھوڑوں کا تھال بڑھایا تھا اور سارے منظر دھندلے پڑتے پڑتے معدوم ہونے لگے تھے اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئیں تھیں۔

☆☆☆.....

”ہیا! امو جان کہاں ہیں وہ ٹھیک تو ہیں.....؟“

رافعہ کو جیسے ہی ماں کے بارے میں پتہ چلا تھا وہ دوڑی ہوئی آئی تھی اس نے خاموشی سے آئی سی یو کی جانب اشارہ کر دیا تھا اور آنسو متواتر چالوں کو تر کر رہے تھے راعیہ آ کر بہن سے لپٹ گئی تھی اور وہ اسے چپ کروانے کی بجائے خود بھی رو رہی تھی۔

”رافعہ! یہ کیا بچپنا ہے آپ بہن کو چپ کروانے کی بجائے خود بھی رو رہی ہیں۔“ ذیشان یزدانی اہل کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے تھے اور وہ روتے ہوئے بہن کے آنسو صاف کرنے لگی تھی۔

”ذیشان! امو جان.....“

”حوصلہ رکھو رافعہ! آنٹی کو کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے ہمت بندھا رہے تھے جیسی آئی سی یو کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر باہر آیا تھا۔

”گھبرانے کی بات نہیں ہے شی از آڈٹ آف ڈیجمرز.....“ ڈاکٹر کے کہنے پر ان لوگوں کی جان میں جان آ گئی تھی اور رافعہ لپک کر آئی سی یو میں داخل ہو گئی تھی۔

”آپ پلیز..... باہر بٹھریئے ابھی یہ بے ہوش ہیں کچھ ہی دیر میں روم میں شفٹ کر دیں گے تب آپ لوگ پیشفت سے مل سکتے ہیں۔“ وہ نم پلکوں سے بے سدھ لٹیٹی ماں کو دیکھ کر باہر نکل آئی تھی۔

”ہیا! گھر میں ایسا کیا ہوا تھا جو امو جان کو ہارٹ ایک.....“ وہ بہن سے پوچھنا چاہتی تھی مگر ذیشان یزدانی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ایسا کرنے سے آنکھ کے اشارے سے روک گئے تھے جبکہ وہ خاموشی سے بس آنسو بہاتے جا رہی تھی۔

”روؤ نہیں ہیا! اب ہماری امو جان بالکل خطرے سے باہر ہیں۔“ اس نے بہن کے آنسو پونچھے تھے اور اس کی نگاہ گالوں پر موجود انگلیوں کے نشانات پر ٹھہری گئی تھی وہ اسے پوچھنا چاہتی تھی مگر وقت اور جگہ مناسب نہیں تھی اس لئے وہ چپ کر گئی تھی مگر دل میں ہزاروں خدشے در آئے تھے اور وہ ذیشان کے کہنے پر نیل گیلانی کے پاس آ گئی تھی جو کافی نڈھال سے کرسی پر بیٹھے تھے اور وہ خاموشی سے ان کے برابر بیٹھ گئی تھی مگر باپ سے بے تکلفی نہ تھی اس لئے کچھ کہنے کی اس میں ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی جبکہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھے اسے اپنے پاس دیکھ کر چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے انہوں نے بیٹی کو آنسو بہاتے دیکھ بھی ایک لفظ تسلی کا نہیں بولا تھا ان میں کسی سے مخاطب ہونے کی ہمت ہی نہیں تھی ان دنوں کا غم مشترک تھا مگر..... وہ دونوں ایک بہت عظیم رشتے میں بندھے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کئی صدیوں کے فاصلے پر کھڑے تھے جانے انہیں خاموش بیٹھے کتنی دیر ہو گئی تھی کہ راعیہ نے نجمہ گیلانی کے روم میں شفٹ ہو جانے کی اطلاع دی تھی۔

”پیا جانی! امو جان کو ہوش آ گیا ہے۔“ راعیہ نے نرم لہجے میں بتایا تھا اور رافعہ فوراً اٹھ گئی تھیں۔

”آپ ابھی آجائے پیا جانی.....“ رافعہ نے

باپ سے کہا تھا مگر انہوں نے ان لوگوں کو جانے کو کہا تھا اور خود باہر کی جانب قدم بڑھا چکے تھے۔

”اب کیسی ہیں امو جان.....؟“ رافعہ ان کا ہاتھ تھامے خبریت پوچھ رہی تھی مگر وہ بالکل خاموش تھیں اور تسبیح کو اندر آتے دیکھ انہوں نے آنکھیں سوند لیں تھیں اور اس کے پیچھے نفیسہ بانو بھی تھیں۔

”آپ سب باہر چلے جائیں پیشفت کو آرام کی ضرورت ہے۔“ نرس کے کہنے پر وہ سب باہر نکل گئی تھیں بیانیے ماں کے زرد چہرے کو نم پلکوں سے دیکھا تھا اور ان کے سر ہانے بیٹھ گئی تھیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ پر رکھا اس کا ہاتھ ہٹایا تھا مگر آنکھیں ہنوز بند ہی تھیں اور وہ روتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں اس کا رخ باہر کی جانب تھا وہ سوچوں کے گرداب میں پھنسی پیدل چلتے ہوئے کافی دور تک آ گئی تھی پیچھے سے گاڑی کا ہارن مستقل بج رہا تھا مگر وہ ارد گرد کا ہوش بھلائے سیدھی چلی جا رہی تھی کہ اس کے بہت نزدیک گاڑی کے بریک چر چرائے تھے وہ آواز پر حال میں لوٹ آئی تھی وہ کافی دیر سے ہارن دے رہا تھا اس لئے باہر نکل آ پاتا تھا مگر اپنے سامنے بجھے ہوئے چہرے اور سوچیں ہوئی آنکھوں کے ساتھ تسبیح کو دیکھ اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا اور بیانیے ارد گرد نگاہ دوڑا کر وقع الحسن کو دیکھا تھا اور آنسو صاف کر کے جانے کو قدم بڑھائے تھے جبکہ یہ جگہ اس کے لئے نئی تھی وقع الحسن نے اس دن کی بے عزتی بھلا کر صرف اس کی دگرگوں کی حالت کے پیش نظر بازو سے پکڑ کر فرنٹ سیٹ پر دھکیلا تھا اور گھوم کے آ کر گاڑی اشارت کر دی تھی تسبیح نے کسی قسم کا ری ایکشن دکھانے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی تھی بہت دفعہ اس کے دل نے مجبور کیا کہ وہ اسے روتے کا سبب پوچھے مگر وہ ایسا نہیں کر سکا تھا اور بہت خاموشی سے سفر طے ہو گیا تھا گیلانی ہاؤس کے سامنے گاڑی رکی تھی اور وہ فرنٹ ڈور کھول کر اتر گئی تھی وہ اپنے

خاموشی سے جانا دیکھ رہا تھا، جیسی اس کی نگاہ ذیشان یزدانی اور روتی ہوئی راعیہ پر پڑی تھی اور وہ گاڑی سے باہر آنے پر مجبور ہو گیا تھا راعیہ نے اسے نغمہ گیلانی کے ہارٹ ایک کا بتایا تھا اور وہ ہاسپٹل و وارڈ نمبر پوچھتا واپس گاڑی میں آ بیٹھا تھا۔

☆☆☆.....

”ریا! مجھے بتاؤ گھر میں کیا ہوا تھا؟ اموجان کی“

”بجیا! اموجان کی اس حالت کی ذمہ دار دادی ماں ہیں انہوں نے بیا اور جمشید کے رشتے کی بات.....“

”واٹ..... یہ تم کیا کہہ رہی.....“

”بجیا! اموجان نے تو صاف انکار کر دیا تھا مگر بیا نے کہا انہیں جمشید سے شادی پر اعتراض نہیں ہے اور اموجان اور پاپا جانی کے بہت روکنے کے باوجود بیا بھند ہو گئیں دادی ماں نے رضیہ پھوپھو اور نکاح خواں بلوالیا اور بیا کا نکاح جمشید سے ہو گیا اموجان یہ صدمہ نہ جھیل سکیں اور انہیں ہارٹ ایک.....“ وہ اب بری طرح رو رہی تھی جبکہ رافعہ اور اس کا شوہر بیا کی جمشید سے نکاح کا سن کر گنگ سے بیٹھ رہ گئے تھے۔

☆☆☆.....

”بیا! رافعہ دستک دیتی روم میں آ گئی تھی۔“

”رافعہ! آپ کب آئیں.....؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”آدھے گھنٹے پہلے ہی آئی ہوں ذیشان چھوڑ کر گئے ہیں رات میں لینے آئیں گے۔“ اس نے کہتے ہوئے اس کا جائزہ لیا تھا، ملگجے بلو پر غصہ سوٹ میں اس کی رنگت بھی کافی زردی ہو رہی تھی۔

”بیا! تم نے اتنا بڑا فیصلہ ایکدم ہی لے لیا اموجان کے انکار کی بھی پرواہ.....“

”اموجان! کا اقرار یا انکار کتنا معنی رکھتا ہے یہ آپ جانتی ہیں سارے فیصلے دادی اور پاپا جانی کے ہوتے ہیں اور جب مجھے بھی انکار نہ تھا تو میں کیوں کسی

بھی بات کی پرواہ.....“

”آر یو میڈ بیا.....؟ ایک ایسا رول انسان سے شادی پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں تھا؟ یہ کہو ایسا تم نے صرف پاپا جانی کی ضد میں کیا، مگر ایسا کرتے تم ایک بار تو زیر کے بارے میں سوچتیں محبت کرتا ہے تم سے وہ.....“

”میں کسی کی محبت نہیں مانتی، یہ محبت و جنت کچھ ہوتی ہی نہیں ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی مگر اندر کچھ ٹوٹا جا رہا تھا مگر وہ بظاہر کھنور بنی ہوئی تھی۔

”بیا! بہت پیچھتاؤ گی اور تم نے تو اپنی بات ثابت کر دی کہ تم کسی لوے لکڑے سے شادی کر لو گی اسے نہیں جو تم سے محبت کا دعویدار ہوگا، جیسی تو تم نے زیر کی جگہ جمشید کو دے دی، لیکن تمہارا فیصلہ بہت غلط ہے۔“

رافعہ اسے ڈپٹ رہی تھی اور وہ جواباً کچھ نہ بولی تھی۔ اس کے پاس کچھ کہنے کو تھا ہی نہیں۔

”بیا! اس رشتہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے یہ رشتہ ختم.....“ راعیہ کے آنے کی وجہ سے وہ خاموش ہو گئی تھی اور اسے آنے کا کہہ کر وہ دونوں ہی اس کے روم سے نکل گئی تھیں۔

☆☆☆.....

”اماں! اس رشتے کو ختم ہی سمجھیں، ہم بیا کی رخصتی کبھی نہیں کریں گے۔“ نفیسہ بانو نے ایک ہی ہفتہ میں رخصتی کی بات چھیڑ دی تھی اور نغمہ گیلانی بہت نفی سے انکار کر گئی تھیں۔

”نکاح تو ہو چکا ہے تم رخصتی سے کیسے منع.....“

”اماں! نغمہ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔“ نفیسہ بانو نے بیٹے کو دیکھا تھا ماں کی جی حضوری کرنے والا آج بیوی کی حمایت میں بول ہی اٹھا تھا۔

”ہم اس رشتے کو ختم.....“

”مگر میں ایسا نہیں چاہتی۔“ بیا نے باپ کی بات کو کاٹ کر کہا۔

”تم چپ رہو بیا! اگر اس دن بھی تم مداخلت نہ

کر تیں تو یہ نکاح کبھی نہ ہوتا۔“ رافعہ نے اسے ڈپٹا تھا۔

”میں نے نکاح اپنی مکمل رضامندی سے کیا ہے اور رخصتی کی بات بھی..... مجھے نہ ظلم چاہئے اور نہ ڈائیورس اس لئے آپ لوگ رخصتی کی تیاری.....“

”بکواس بند کرو بیا! ابھی تم اتنی بڑی نہیں ہوئی ہو اور جو شخص شادی کا مطلب.....“

”رافعہ! جو لوگ شادی کا مطلب جانتے ہیں وہ کوئی پوری کر لیتے ہیں جو ایک پاگل نہیں کر سکے گا.....؟“ وہ ہر جذبے سے عاری لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”اماں! آپ اسی وقت رضیہ باجی کو فون کریں اور ان سے کہیں کہ وہ آ کر اپنی بہو کو لے جائیں۔“

ساکت بیٹھے نیل گیلانی حیرت سے بیوی کو دیکھنے لگے تھے جبکہ وہ اٹھ کر اپنے روم میں چلی گئی تھیں جبکہ وہ سب ساکت بیٹھے رہ گئے تھے اور کچھ ہی دیر میں ان کی واپسی ہوئی تھی ان کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جس میں وہ بیا کے جینز کے لئے چیزیں جمع کیا کرتی تھیں جیسے انہوں نے تیسہ کے قدموں کے پاس رکھا تھا اور اس کے عین سامنے کھڑے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔

”میں نے تمہیں جنم دیا بچپن سے لے کر تمہاری جوانی تک، تمہیں ایک نازک کالج کی طرح سنبھالا اور تم مجھے میری خاموشی اور باپ کی بے حسی کی سزا دینے کے لئے ہمارے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ بچپن میں جب تم چلتے چلتے گر جاتی تھیں تو توپ کرتے تھے ان ہاتھوں میں تھام لیا کرتی تھی جب تم باپ کی بے حسی پر آنسو بہایا کرتی تھیں تو ان ہاتھوں سے تمہارے آنسو پونچھا کرتی تھی، میں نے ساری زندگی اگر چہ لگائے رکھی تو صرف اپنا گھر بچانے اور تم تینوں کے لئے کیونکہ باپ جیسا بھی ہو باپ ہوتا ہے مگر تم میری فیملی ابھی نہیں کچھ برس بعد سمجھو گی، میری دعا تو یہی ہے کہ تم خوش رہو مگر جانتی ہوں صرف ہم سے انتقام لینے کے لئے تم نے بہت غلط راہ

چنی ہے اور میری دعاؤں کو نامراد لوٹنا ہے میں ماں ہوں نا بیٹی کے اندر پکتے لاوے اور اس کی نفرت کو خوب سمجھتی ہوں اور جب تمہاری دادی کے انتقام کی آگ میں برسوں جل سکتی ہوں تو اپنی اولاد کا ہر وار بھی سہ سکتی ہوں، تمہیں لگتا ہے کہ میں اگر خاموش نہ رہتی تو تمہارے باپ کا رویہ تمہارے ساتھ اچھا ہوتا، لیکن..... احساس لفظوں سے نہیں جذبے سے چپتا ہے اور تمہیں لگتا ہے کہ تمہارا باپ تم سے نفرت کرتا ہے مگر..... نہیں..... اس شخص کو نفرت کرنی آتی ہی نہیں ہے اور نہ اسے محبت کرنی آتی ہے یہ محبتوں کو سینے میں دبا کر رکھنے والا شخص، اسے زندگی میں کبھی کوئی سکھ نہیں ملا پہلے اسے اس کی ماں نے اپنے انتقام کا نشانہ بنایا اور اب اس کی اپنی اولاد نے..... زندگی تمہاری فیصلہ تمہارا..... اور ہم تمہیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس گھر سے رخصت کرتے ہیں۔“ انہوں نے بیٹی کا ہاتھ تھامنا تھا اور اسے گھر کی چوکھٹ کے باہر کھڑا کر کے وہ سوٹ کیس اس کے پاؤں کے پاس رکھا تھا۔

”جائے اماں! جیسے میری ماں نے مجھے آپ کے حوالے کیا تھا آج میں اپنی بیٹی آپ کی بیٹی کے حوالے کرتی ہوں۔“ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر ان دونوں کو تسبیح کے برابر کھڑا کیا تھا اور دروازہ بند کر کے اسی دروازے سے ٹیک لگا کر بلک اٹھیں تھیں انہیں ان کی قربانیوں کا بہت خطرناک صلہ ملا تھا، مگر وہ اتنا اپنی بربادی پر نہیں روئی تھیں جتنا آج بیٹی کی بربادی پر تڑپ رہی تھیں۔

☆☆☆.....

تسبیح کو جیسے روایتی طور پر رخصت نہیں کیا گیا تھا، اسی طرح روایتی استقبال سے بھی وہ محروم ہی رہی تھی احمد صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر جب میں سے ہزار کانوٹ نکال کر اسے دیا تھا سب تو کافی حیرانگی سے تسبیح کو دیکھ رہی تھی اسے اس گھر میں جس کے

حوالے سے لایا گیا تھا وہ ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھا کیلے کھانے میں مشغول تھا اور جب وہ کھا چکا تو اس نے چٹکے اٹھا اٹھا کر پھینکا شروع کر دیے تھے اور تالیاں بجاتا ماں کے پاس آ گیا تھا۔

”ماں خالی کھالی۔“ چھب سب۔ اس نے اپنا گندا منہ رضیہ بانو کے دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے خوشی خوشی اپنا کارنامہ بتایا تھا اور تسبیح پر نگاہ پڑتے ہی وہ زور زور سے تالیاں پیٹتا ”دہن دہن“ کی گردان کرنے لگا تھا۔

رضیہ بانو نے تسبیح کا ایک ہفتہ قبل جو کہہ کر تعارف کروایا تھا وہ اس کے ذہن سے چٹ گیا تھا تسبیح بہت خاموشی سے نگاہ جھکائے بیٹھی تھی جبھی رضیہ بانو نے سمیہ کو اسے جمشید کے کمرے میں چھوڑ آنے کو کہا تھا مگر وہ سمیہ کے اٹھنے سے پہلے ہی سوٹ کیس کھینچتی خود ہی چل پڑی تھی وہ اس گھر میں پہلے بھی بہت بار آ چکی تھی جمشید کے کمرے سے وقفہ بھی مگر آئی پہلی دفعہ بھی اچھا خاصا بڑا کمرہ تھا مگر پورے کمرے میں یہاں تک کہ بند کے اوپر بھی پیٹھے ہوئے اخبار اور کھلونے بکھرے ہوئے تھے اس نے ایک کونے میں سوٹ کیس رکھا تھا اور کمرے کی صفائی شروع کر دی تھی اس نے بکھری چیزیں سیٹ کر چادر درست کی تھی اور وہ فارغ ہی ہوئی تھی کہ سمیہ اسے کھانے پر بلانے آ گئی تھی اس نے آنے کا کہہ کر واش روم کا رخ کیا تھا اور جس وقت وہ ڈانٹنگ ہال میں داخل ہوئی اسی کا انتظار ہو رہا تھا وہ خاموشی سے جمشید کے برابر والی خالی چیمبر پر بیٹھ گئی تھی جمشید کی دائیں طرف رضیہ بانو بیٹھی تھیں اور بٹے کو چاول کھلا رہی تھیں، تسبیح نے کھانا شروع کرنے کی بجائے ہاتھ بڑھا کر رضیہ بانو کے آگے سے پلیٹ اٹھائی تھی اور اسے جمشید کو کھانا کھلاتے دیکھ کر ان سب کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب سمٹ آیا تھا اور وہ طنز سے مسکراتے ہوئے بنا رہ نہیں سکی تھی۔

”اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے مجھے یہاں جس مقصد کے تحت لایا گیا ہے اسے ہی انجام دینے کی کوشش کر رہی ہوں اور بے فکر رہیں پھپھو! مجھ سے آپ کو ایسی شکایت نہ ہوگی جس کی مجھ سے امید تھی۔“ اسے چپچہ بھر کر جمشید کے منہ کے نزدیک کیا تو جسے اس نے ہاتھ مار کر گرا دیا تھا اور ماں کے ہاتھ سے کھانا ہے کی رٹ لگا دی تھی۔

”مجھے یہ ذمہ داری ملتے ہی ملے گی مگر میں امید پر کھری اتروں گی۔“ وہ کچھ کھائے بنا کرسی کھڑکا کر اٹھ گئی تھی اور کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہ کی تھی یہ تھا اس کا سسرال میں پہلا دن آگے کیا ہوتا تھا یہ تو رب کو ہی معلوم تھا۔

”زہیر بھانا۔“ جانے کہاں رہ گئے ہیں وہ ہوتے تو کم از کم مجھے تفریح کروانے ہی لے جاتے گھر میں بیٹھے بیٹھے تو میں بور ہو کر رہ گئی ہوں۔“ اس نے بے آواز بلند دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔

”گھر کے کام کاج میں ماں کا ہاتھ بنایا کروا گئے گھر کیا لے کر جاؤ گی؟“ نفیہ بانو نے اسے ڈپٹا تھا اور وہ منہ بنانے لگی تھی۔

”میری پیاری نانوا! یہ نوکڑ آخر کس مرض کی دوا ہوتے ہیں۔“ وہ نواسی کو گھوڑنے لگی تھیں۔

”اسلام علیکم.....“ سمید نے اندر آتے ہوئے سلام کیا تھا اور وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے قدم بڑھا رہا تھا کہ سمید جلدی سے اٹھ کر اس کی راہ میں آ گئی تھی۔

”سمید پلیز..... مجھے آسکریم کھلانے لے چلو۔“ سمید سے وہ اتنی آس سے بولی تھی کہ وہ باوجود تھکن کے اور اپنی نیچر کے خلاف فوراً راضی ہو گیا تھا اور اس کی تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی کیونکہ وہ پوچھ تو بیٹھی تھی مگر امید نہ تھی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں بھی جانے کی۔“ رضیہ بانو نے کہا تھا اور باہر آئی تسبیح بھی ان کی طرح

لنگ گئی تھی۔

”لیکن کیوں.....“ وہ نردوٹھے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”بھائی! ابھی گھر میں داخل ہوا ہے اسے چائے نی.....“

”مما! سمید پہلی دفعہ تو اس گھر میں نہیں آیا اور پ مجھے کبھی سمید کے ساتھ جانے ہی نہیں دیتیں ہیں لہذا زہیر بھانا کے ساتھ جانے سے کبھی نہیں روکتیں اور وہ کس سے آنے کے بعد بھی کتنی دفعہ مجھے آؤٹنگ پر لے جا چکے ہیں اور سمید تو اپنے دوست.....“

”بگو اس بند کر کے اپنے کمرے میں جاؤ۔“ وہ دتے ہوئے چلی گئی تھی جبکہ تسبیح حیران تھی۔

”تم کیا کھڑی کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہو چائے ملے لی یا نہیں.....؟“ وہ خاموشی سے کچن میں آ گئی تھی اور ربار اس کا ذہن سمیہ کی باتوں اور رضیہ بانو کے سخت انداز کی طرف ہی جارہا تھا۔

”پتہ نہیں کیوں سوئی! ایسے کہہ رہی تھی اور سمید بھی تو سب سے الگ تھلگ رہتا ہے جانے کیا وجہ ہے.....؟“ سوچتے سوچتے ہی چائے بن گئی تھی اور وہ کپوں میں نکالنے لگی تھی وہ اس گھر میں کافی یڈ جسٹ ہو گئی تھی گھر کے سارے کام وہی کرتی تھی ور جمشید کی مکمل ذمہ داری بھی اس نے سنبھال لی تھی ور گزیرے 18 دنوں میں وہ ایک بار بھی گیلانی آؤس نہیں گئی تھی اور نہ ہی اسے کوئی ملے آیا تھا بس ایک دفعہ رافعہ ذیشان یزدانی کے ساتھ آئی تھی اور شکل سے پندرہ منٹ بیٹھ کر اس کا حال احوال پوچھ کر لوٹ گئی تھی وہ ٹرے اٹھا کر لاؤنج میں داخل ہوئی تھی اور اسی وقت زہیر بھی باہر سے اندر آیا تھا سوٹ کیس رکھتے ہوئے اس کی نگاہ تسبیح پر پڑی تھی اور اس کی رگ شرارت پھڑکی تھی وہ اب تک تبدیلی شے سے مکمل انجان ہی تھا۔

”وہ ہمارے گھر میں خدا کی قدرت کبھی ہم ان کو تو

کبھی..... ان کے ہاتھ کی بنی چائے کو پیتے ہیں۔“ زہیر نے ایک کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا تھا اور اسے شرارت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا اور وہ ماں بیٹی اس کی آنکھوں میں موجود چمک دیکھ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگی تھیں۔

”مجھے تم اس طرح اپنے گھر میں کام کرتی ہوئی بہت اپنی اپنی لگ رہی ہو مگر یہ سورج کہاں سے نکلا تھا جو تسبیح گیلانی نے ہمارے غریب خانے کو عزت بخشی ہے۔“ پہلی بات سرگوشی میں کہہ کر بات کا اختتام با آواز بلند کیا تھا۔

”آپ لاعلم ہیں اس لئے بتا دوں دیوڑھی کہ اس غریب خانے پر اتنا ہی حق میرا بھی ہے جتنا کہ آپ کا.....“ وہ کہنا ہی شروع ہوئی تھی کہ وہ لفظ ”دیوڑھی“ پر ہی جھٹکا کھا کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا..... یہ کیا بکواس.....“

”بکواس کیسی..... یہی تو حقیقت ہے آپ کے سامنے تسبیح جمشید کھڑی ہے اور یقین نہ آئے تو اپنی ماں اور نانی سے پوچھ لیں۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہتے ہوئے ان دونوں کی جانب اشارہ کیا تھا جبکہ وہ کافی حیرانگی سے کبھی بپا کو تو کبھی ماں اور نانی کو دیکھ رہا تھا اور اسی پل جانے کون سے کونے سے جمشید آ نکلا تھا اور تسبیح کا دھانی آ نچل کا کونا پکڑ کر کھینچنے لگا تھا وہ اسے کچھ دکھانا چاہتا تھا اور وہ بپا کو جمشید کے ساتھ جانا دیکھ رہا تھا۔

”زہیر بیٹا! ابھی سفر سے آیا ہے جا کر منہ ہاتھ دھو.....“

”اماں! بتائیے کیا ہے یہ سب.....؟ بپا کیا کہہ رہی تھی.....؟“ وہ کافی دیر بعد بمشکل بولنے کے قابل ہوا تھا۔

”بپا نے جو کہا وہ سچ ہے مگر ایسا ہم نے مجبوری.....“

”نانو! ایسی کون سی مجبوری اور کیا آفت ٹوٹ

”میں..... تسبیح جمشید..... یہاں اپنے شوہر کے گھر میں اس کے کمرے کی دیوار میں لگی گھڑکی ہوں اور میرا شوہر اس وقت خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے جس شخص کے نام میں نے اپنی پوری زندگی لکھ دی ہے وہ اس رشتہ کی حقیقت اور خوبصورتی سے ناواقف ہے میں نے اس کی دماغی حالت جانتے ہوئے بھی اس سے شادی کی میری ماں مجھ سے ناراض ہو گئی ماں سے ملے ہوئے مجھے پورے 24 دن ہو گئے ہیں اور کچھ دیر قبل میری اکلوتی دوست بھی مجھ سے خفا ہو کر چلی گئی ہے سب کو لگتا ہے کہ میں ایک خود پسند اور ضدی لڑکی ہوں صرف اپنے بارے میں سوچتی ہوں دوسروں کے جذبات اور احساسات کا مجھے کبھی خیال نہیں ہوتا میں محبت سے نفرت کرنے والی سراپائے نفرت اور ہٹ دھرم ہوں مگر کوئی اور کیوں نہیں سوچتا کہ میں ایسی ہوں تو کیوں ہوں.....؟ محبت میں اسی وقت کرسکوں گی جب مجھے اس حرنی لفظ سے رتی برابر بھی آشنائی ہوگی میرا تو اس لفظ سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہے مجھے زندگی میں کبھی محبت نہیں ملی میں آج اپنے ماضی میں جھانکوں تو سوائے کاٹ دار نظروں، نفرت بھرے جلوں، نحوست کے طعنوں کے علاوہ کوئی سدا میرے کانوں میں دستک نہیں دیتی میں اپنے بچپن کو یاد کروں تو سوائے محرومیوں کے مجھے کچھ یاد نہیں آتا اور جب مجھے پناہیت اور محبت ملی ہی نہیں تو اسے تقسیم کیسے کرتی سارہ مجھ سے ناراض ہو کر چلی گئی ہے اور میں آج اپنے ماضی کے اور اراق پلٹنے پر مجبور ہو گئی ہوں گزرے ہوئے لمحوں کے واقعات ذہن کی اسکرین پر چل رہے ہیں جنہیں میں تازہ کرنا چاہتی ہوں تاکہ خود مجھے کبھی تو اندازہ ہو سکے کہ میں نے جمشید سے شادی کر کے کونسا غلط قدم اٹھایا ہے اور میں اب مکمل ماضی

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا تھا اور وہ نفی میں سر ہلاتی روم سے باہر آ گئی تھی وہ کافی دیر تک سمید کے بارے میں سوچتی رہی تھی اسے کچھ عجیب سا خیال آ رہا تھا، پھر اس نے سر جھٹک کر سونے کا ارادہ کیا تھا، جبھی اسے سارہ کی باتیں یاد آ گئی تھیں آج شام وہ آئی تھی اور جشید کو اس کے شوہر کے روپ میں دیکھ کر کافی کچھ سنا کر تعجب تھی اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں اور کل کی رضیہ بانو اور زہیر کی باتیں بھی اسے یاد آنے لگی تھیں وہ ایک نظر سوئے

”اماں! میں نے بیا اسے محبت کی ہے اور یہ دو چار دنوں کی نہیں سالوں پرانی بات ہے‘ میرے دل نے دھڑکنا ہی بیا کے لئے شروع کیا اور میں اس لڑکی کو خود سے زیادہ جانتا ہوں‘ وہ بدتمیز پھوہڑ‘ بد زبان سب کچھ ہو سکتی ہے مگر لوز کر یکسر نہیں..... جشید سے شادی میں یقین سے کہہ سکتا ہوں‘ آپ دونوں کی ملی بھگت‘ ماموں جان کی فرمانبرداری اور بیا کی ہٹ دھرمی و ضد کی وجہ سے ہی ہوئی ہوگی مگر مجھے اس بات کا افسوس ساری زندگی رہے گا کہ میں نے جس لڑکی کی چاہ کی تھی میری ماں نے جانتے بوجھتے اسے مجھ سے دور کر دیا‘ کاش..... کہ میں آپ پر بھروسہ نہ کرتا‘ تو شاید آج میری محبت میری بھائی کے روپ میں میرے سامنے نہ آئی۔“ وہ لڑکی سے کہتا گھر سے ہی نکل گیا تھا اور یہ اس کا معمول بن گیا تھا‘ صبح کا گھر سے نکلا رات گئے گھر آتا اور آکر اپنے کمرے میں قید ہو جاتا‘ اس نے اپنا فراسٹر کروانے کے لئے لیٹر دے دیا تھا‘ مگر ابھی پروسس ان کمپلیٹ تھا‘ اس لئے وہ یہاں رہنے پر مجبور تھا‘ رضیہ بانو سے تو اس نے بات کرنا ہی چھوڑ دی تھی یہاں تک کہ وہ کسی سے بھی بات نہیں کرتا تھا‘ وہ تھا اور اس کی تنہائی.....“

”اہاں.....“ زہیر نے ماں کو ٹوکا تھا۔
 ”سچ سننا چاہتا تھا تا تو اب کیوں روکتا ہے کیونکہ
 یہی سچ ہے کہ بیا گھر سے بھاگ رہی تھی نجمہ اسپتال پہنچ
 گئی اور میں نے بھائی کی عزت کی خاطر اسے اپنی بہو
 بنالیا، ورنہ اس کے کرتوت تو ایسے تھے کہ کوئی تھوکتا بھی
 پسند نہ کرتے یہ میرا ہی حوصلہ تھا کہ اسے بیاہ کر لے
 آئی۔“ انہوں نے بڑی خوبصورتی سے داستان سنائی تھی
 دروازے کی چوکھٹ پر تسبیح ہے یقینی بہ منہ پر ہاتھ۔

میں کھونے لگی ہوں مجھے اپنا بچپن لڑکپن اور جوانی کے دن ایک ایک کر کے یاد آنے لگے ہیں جب میں سیدھے نیل گیلانی ہوا کرتی تھی اور میرا باپ ہی مجھ سے سب سے زیادہ نفرت کیا کرتا تھا مجھے کوئی ایک لمحہ یاد نہیں ہے جب انہوں نے میری جانب نگاہ کی ہو یا میرے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا ہو۔ ٹھنڈے ہوا کے جھونکے اس کے گلابی چہرے پر پڑ رہے تھے چند لیس ہوا سے چھینر چھاڑ کرنے لگی تھیں اس نے کھڑکی بند کر کے پردے برابر کئے تھے اور مثال کاندھوں پر درست کرتی کمرے میں موجود اکلوتی کرسی اٹھا کر کھڑکی کے پاس رکھی تھی اور اس پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں تھیں اور پرانے گزرے منظر اسے یاد آنے لگے تھے اور وہ اپنا احتساب کرنے لگی تھی کہ وہ کہاں غلط تھی اور کہاں اس کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔

☆☆☆☆☆

”مجھے وہ دن آج بھی اپنی مکمل جزئیات کے ساتھ یاد ہے جب میرا 4th کلاس کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا میں نے فرسٹ پوزیشن لی تھی اور مجھے ٹرائی ملی تھی اور میں بہت خوش خوش گھر میں داخل ہوئی تھی اس دن فرائی ڈے تھا پاپا جانی مجھے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھے نظر آ گئے تھے اور میں صاف ستھرا یونیفارم پہنے ہاتھ میں ٹرائی لئے پاپا جانی کی طرف دوڑتی ہوئی گئی تھی اور خوش خوشی منہ کھولا ہی تھا کہ پاپا جانی ایک ہاتھ سے مجھے پرے دھکیلتے اپنے روم میں چلے گئے تھے اور پیچھے پلٹ کر یہ بھی دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی مجھ پر کیا گزری اور یوں دھکا دینے کی وجہ سے صوفے سے میرا سر ٹکرا گیا تھا اور مجھے اپنے ماتھے سے نکلنے خون سے زیادہ پاپا جانی کے رویے نے دکھ دیا تھا میں بہت چھوٹی تھی مگر جب اپنی ہم عمر بچیوں کو باپ کی انگلی تھام کر اسکول آتے دیکھتی تھی تو ایسی ہی خواہش میرے بھی دل میں جاگا کرتی تھی مگر میرے پاپا جانی تو مجھ پر ایک نگاہ ڈالنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے اور پاپا جانی ہی نہیں

دادی ماں کا بھی میرے ساتھ رو بہ پاپا جانی جیسا ہی بس فرق یہ تھا کہ پاپا جانی نے مجھے بھی مخاطب نہیں تھا اور دادی ماں ہر وقت مجھے کوستی رہتیں تھیں مجھے منخوا اور جانے کیا کیا کہا جاتا تھا میرے جڑواں بھائی قاتل میں نہیں تھی مگر مجھے بچپن سے یہ احساس دلایا کہ میں بلا سبب دنیا میں آ گئی اس کی جگہ میں کیوں مر گئی زندگی اور موت میں میرا کوئی دخل نہ تھا مگر یہ قاتل ٹھہرائی گئی مجھے ہر جگہ سے غصہ اور نفرت ہی ملتا چاہے وہ پاپا جانی دادی ماں ہو یا پھوپھو اور زہیر ہونڈہ کو بچپن ہی سے مجھے ستانے میں مزہ آتا تھا جب بھی گھر آتا تھا وہ میری کلر پیٹسلو لے جاتا تھا اور میرا کاپیاں کتابیں بھی خراب کر دیا کرتا تھا اور صرف اس کی وجہ سے مجھے اسکول میں مس سے بھی ڈانٹ تو سب سے مار پڑا کرتی تھی مگر میں کسی سے زہیر کی حرکتوں۔ بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی امواجان اور میری بہنیں وہ ہستیاں تھیں جو میرے لئے فکر مند ہوا کرتا تھیں مگر مجھے ان کی فکر مندی ایک آنکھ نہیں بھایا کرتا تھی کیونکہ امواجان کبھی بھی پاپا جانی کو ان کے برے رویے پر نہیں نوکتی تھیں (مجھے تو کم از کم ایسا ہی لگتا تھا مجھے ہی سمجھاتی رہتی تھیں اور زہیر کی شکایت امواجان سے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ دادی ماں اور پھوپھو سے بہت ڈرتی تھیں اور میں زہیر سے جب کہتا کہ میں اس کی پاپا جانی سے شکایت کروں گی تو وہ مجھے میری اوقات یاد دلانے میں لحد نہیں لگاتا تھا اور میرا لوگوں کے برے رویے سب سے بہتے خود بری بن گئی جب کوئی مجھے کچھ کہتا تو میں اسے ایک کی دو کہہ کر دل کا بھڑاس نکالنے لگی میرے دل کی بھڑاس تو کیا نکلتی دل میں غبار جمع ہوتا چلا گیا اور میں بد زبان و بد تمیز بن گئی (لوگوں کی نگاہ میں) گستاخ کہہ رہا ہے کوئی بے ادب کوئی حق بات کہہ کر ہم تو گناہ گار ہو گئے۔ میں نے لوگوں کو ان کے رویے لوٹانے شروع کئے تب بھی میں مطمئن نہ تھی جانے کیسی بے چینی میرے وجود

احاطہ کرنے لگی تھی مجھے کوئی چیز کتنی ہی چاہے پسند کیوں نہ ہو میرے گھر والے بھولے سے بھی اس کی تعریف کر دیتے یا وہی چیز کسی اور کو بھی پسند ہوتی تو خود بہ خود مجھے اس شے سے نفرت ہو جاتی تھی اور میں منفی رویوں کو اپنے اندر پروان چڑھاتی اپنے بچپن کو الوداع کہہ رہی تھی بچپن کی کوئی ایک یاد ایسی نہیں ہے جو میرے یوں پر مسکراہٹ کھلا دے امواجان میری سالگرہ منانی تھیں مگر میری 8th برتھ ڈے جب تھی اس دن پاپا جانی نے مجھے کیک کاٹنے دیکھ لیا اور وہ میری آخری سالگرہ تھی میرا لڑکپن بھی بچپن کی طرح مجھے ایک لمحہ کی خوشی کے سوا کچھ نہ دے کر گیا۔ سیدھے کی بند پلوں کے پیچھے وہ مسکرائے لگا تھا اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول کر بے ساختگی میں اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

☆☆☆☆☆

تسبیحہ بری طرح اس لمحے میں کھوئی ہوئی تھی اسے وہ سہ پہر یاد آنے لگی تھی جب وہ گھر میں اکیلی تھی سب پھوپھو کی طرف گئے ہوئے تھے وہ نہیں گئی تھی اور اب ہیرا سے لینے آیا تھا وہ لان میں چیئر پر بیٹھی چائے پی رہی تھی جب اس نے اسے پیچھے سے آکر ڈرایا تھا وہ ناک آواز پر دہل کر کھڑی ہو گئی تھی اور جیسے ہی زہیر پر اہ بڑی تھی اس کے خوبصورت چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی اور وہ کافی ٹیکھی نگاہوں سے دیکھتی کہے بنا رہے میں سکتی تھی۔

”تمیز تو آپ کو کبھی آ ہی نہیں سکتی۔“ وہ اتنا کہہ کر رر کی جانب بڑھی تھی مگر وہ اس کی کالی تھام کر اسے کہتے ہوئے بولا تھا۔

”پپی برتھ ڈے بیا!“ زہیر اس وقت بی کام غل ایتر میں تھا اور اس نے ایسی حرکت پہلی دفعہ کی تھی تسبیحہ نے خاموشی سے کلائی چھڑا کر ایک بار پھر م بڑھائے تھے۔

”گفٹ نہیں اوگی بیا“ وہ راد میں آتا بولا تھا اور بے یقینی کی شدت سے کچھ دیر اسے دیکھتی ہنستی چلی

علی تھی۔

”واٹ آ گڈ جوک..... مسز زہیر! گفٹ تو بہت دور کی بات ہے کسی کو میری سالگرہ تک یاد نہیں رہتی ایک منٹ.....“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”بیا! تم کیوں لوگوں کے رویوں کی پرواہ کرتی ہو تم کیا ہو اور میرے لئے کس قدر خاص ہو تصور بھی نہیں کر سکتی تم۔“ تسبیحہ ہر وقت ستانے جلی کئی باتیں کرتے زہیر کی پیار بھری سرگوشی سن کر کافی بے یقینی سی کھڑی تھی کہ اس نے چند قدموں کی دوری مٹاتے ہوئے اس کے عین سامنے کھڑے ہوئے اس کی بے داغ پیشانی پر اپنے لب رکھ دیئے تھے جہاں تسبیحہ جی جان سے کانپ اٹھی تھی وہیں زہیر کو بھی اپنی بے اختیار سی غلطی کا احساس ہوا تھا اور اس سے کچھ دور جا کھڑا ہوا تھا۔

”آئی ایم سوری بیا!“ وہ کچھ دیر بعد بولا تھا اور وہ پیشانی پر سے ہاتھ ہٹائی نظریں جھکائے بس اتنا ہی بول سکی تھی۔

”تم بہت برے ہونڈہیر! میں تمہاری احمد انکل سے شکایت کروں گی۔“ زہیر جو خود کو سنبھال چکا تھا اس پر نگاہ کی تھی گلابی چہرہ لہورنگ ہو رہا تھا ہر وقت غصہ سے اول فول بکٹی اور سرخ پڑتی تسبیحہ کا یہ شرمایا گھبراہٹ اس کے دل کے تار بجایا تھا اور اسے شرارت سوچیں تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس نے بابا کا نام کیوں لیا ہے اپنے پاپا کا کیوں نہیں لیا اگر وہ ایسا کرتی تو وہ الناس کا مذاق اڑاتا بلکہ وہ اپنے بابا سے ڈرتا تھا اور اکثر وہ اسے احمد صاحب کی ہی دھمکی دیا کرتی تھی۔

”اچھا تو! تم بابا سے کیا کہو گی.....؟“ انداز و لہجہ میں شرارت پنہاں تھی جبکہ وہ بے ساختگی میں بولی تھی۔

”میں کہوں گی کہ زہیر نے مجھے.....“ وہ زبان دانوں تلے دبائی تھی اور زہیر ہنستا چلا گیا تھا اور چیئر پر بیٹھی تسبیحہ ماتھے پر ہاتھ رکھے مستقل مسکرا رہی

تھی کسی چیز کے گرنے کی آواز پر وہ مال میں لوٹ آئی تھی اور اس نے اٹھ کر نیرس کی جانب گھلنے والا زور بند کر دیا تھا۔

”بس ایک یہی لمحہ ہے جو میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے اور مجھے آج بھی اپنی پیشانی دو: دونوں کے پیار بھرے لمس پر دہکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اس دن کے بعد وہ اکثر مجھے اس حوالے سے چھیڑا کرتا تھا اور وہ لمحہ میری آنکھوں میں ٹھہر سا گیا تھا میں اکثر رات سونے سے پہلے اس کے بارے میں ضرور سوچتی تھی شروع شروع میں میں زہیر سے کافی کترا یا بھی کرتی تھی مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا مجھے ستانے کے بہانے ڈھونڈ ہی لیا کرتا تھا اور میں پھر وہی ہی بنتی چلی گئی تھی جیسے اس لمحے سے قبل تھی زہیر سے اتنی ہی چڑھتی تھی اور وہ اس لمحے کو فراموش کر گیا تھا کیونکہ ایک دن جب اس نے ذکر چھیڑا ہی تھا کہ میں احمد انکل کے پاس پہنچ گئی تھی یہ تو میں جانتی تھی کہ یہ بات میں کسی سے نہیں کہہ سکتی مگر زہیر کو لگا تھا کہ میں احمد انکل سے کہہ دوں گی اس لئے اس نے مجھ سے ایکسکوز کر لیا تھا میں محبت اور جوانی کے سفر پر ساتھ ساتھ گامزن تھی کہ ایک حقیقت مجھے میری نئی محبت کی کونسل کو اکٹیز کر تنفر برتنے پر مجبور ہو گئی تھی جبکہ میں ابھی اپنے جذبات کو محبت کا نام دے بھی نہ پائی تھی کہ میں نے ایک دن پیا جانی اور اسو جان کی گفتگو سنی وہ زہیر کی بہت تعریفیں کر رہے تھے اور بس وہی لمحہ مجھے محبت کے سفر سے ہٹنے پر مجبور کر گیا، بچپن سے ہم دونوں کی بھی نہیں بچی تھی اور جانے کب اس کے جذبات نے کروٹ بدلی تھی جس کا وہ گاہے بگاہے اظہار بھی کرتا رہتا تھا مگر میں نے صرف پیا جانی کی مخالفت کے لئے اپنی آنکھ کا پہلا پسنا نوج ڈالا محبت کی تو میں شروع سے ہی مخالفت تھی اور اب تو میں اظہار بھی کرتی رہتی تھی اور ایسے ہی آنکھ پھولی میں نے جوانی کی دلہیز پر قدم رکھا انٹر میں نے بانی

سانس سے کیا مگر جب ایک دن اسو جان کی زچا کہ پیا جانی کو ڈاکٹر زہیر بہت پسند ہیں میں آنکھ کا دوسرا پسنا بھی نوج ڈالا اور ڈاؤ میڈ کی بجائے اسو جان کی ہزار مخالفت کے باوجود نے جناح یونیورسٹی میں سائیکولوجی ڈپارٹمنٹ ایڈمیشن لے لیا زہیر اب پھپھو کو میرا رشتہ لا رہا تھا جس کا اس نے مجھ سے بھی اظہار کیا تھا اس کھیل میں بہت مزہ آنے لگا تھا کیونکہ پھپھو قیمت پر مجھے اپنی بیوی نہیں بنانا چاہتی تھیں اور انے خود اپنے کانوں سے سنا تھا اور بچپن کے رو مجھے بھولے نہ تھے پھپھو اور داوی ماں مجھ سے کرتی تھیں تو پیا جانی مجھ سے شدید نفرت کر جبکہ میں انہیں کار تو تھی جس کسی نے پیا جانی :واور وہ مجھے دیکھے تو وہ لمحہ ضائع کئے بنا مجھے ان تسلیم کر لیتا تھا مگر وہ مجھے اسے وارث کا قاتل تھے اور ایسے کسی حق سے کبھی نہ مجھے دیکھا اور نہ اور یہ بات زہیر سے چھپی نہ تھی اس لئے اس تھا کہ وہ جب اپنی ماں کو لے کر آئے گا میرے جان انکار نہیں کریں گے اور اس بات کا تو مجھ سے بھی زیادہ یقین تھا مگر میں یہ بھی جانتی تھی کہ کبھی میرا رشتہ نہیں لائیں گی اور اس احساس ساتھ ہی میرے اندر کچھ جھپن سے ٹوٹا تھا اور میرے لڑکپن کی یاد تھا میرے سامنے آکھڑا ہوا میں اس وقت یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی تھی ہزارا کے دلوے کرنے کے بعد بھی میرا دل ایک لمحہ محبت کو دل میں بے رہنے سے نہیں روک پایا تو میں نے صرف اپنی اندر کی محرومیوں کو اور بڑھ کے لئے اس کھیل کو جاری رکھا تھا پھپھو نے زہیر مستقل اصرار پر مجھے کافی کچھ سنایا تھا۔

”پھپھو! میں زہیر سے کبھی بھی شادی نہیں کرنا چاہتی کیونکہ میں زہیر اور آپ سے شدید نفرت کرتی ہوں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ زہیر صرف اور صرف مجھے چاہتا ہے اور آپ نے اگر زیادہ زہیر کو میری برائیاں مکنوا کی تو آپ بیٹا کھودیں گی۔“ اور انہوں نے بیٹے کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے مجھے ہی نشانہ بنایا اور میں جو جمشید کی شادی رانندہ سے سن کر ہی دھل گئی تھی اور اسی جمشید سے شادی کے لئے ہند:وگنی اور یہ سزا میں نے پیا جانی کی وجہ سے منتخب کی کیونکہ انہوں نے پہلی دفعہ ایک باپ کی حیثیت سے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا اور میری زندگی کا فیصلہ سنایا تھا اور جب نفعہ میں ہی سکی انہوں نے ایک بار کہہ دیا کہ میری شادی جمشید سے ہی ہوگی تو بس مجھے جمشید سے ہی شادی کرنی تھی اسو جانی کا ترپنا میرے قدم روک رہا تھا مگر میں نے قدم پیچھے نہ ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ جس باپ کی ایک نگاہ کی میں بچپن سے منتظر تھی اس نے مجھے بے بسی سے ہی تھی مگر دیکھنا ضرور تھا اور آج جو میری زندگی ہے اس پر مجھے کسی قسم کا کوئی بچھتاوا نہیں ہے کیونکہ اسی زندگی پر چلنے کا فیصلہ مجھے میرے ہی باپ کی نگاہوں میں لانے کا سبب بنا ہے اور میں جو اسو جان کو ان کی خاموشی پر برا بھلا کہتی تھی آج اسی خاموشی کی ردا خود پر تانے ہوئے ہوں مگر میرے اندر کی معصوم بچی ابھی بھی کر لاتی ہے باپ کی شفقت کی منتظر ہے وہ خوشیاں وہ سنے جو میرے اپنوں کی بے حسی اور محرومیوں کے سبب پیدا ہونے والی میری ضد کی نظر:وگنی آج بھی میرے اندر بین کرتی ہیں مگر میں کہیں نہ کہیں یہ سوچ کر مطمئن

دیا ایک وفد بھی تمہارا دل نہیں کاٹتا۔۔۔۔۔؟ تم مجھ سے محبت نہیں کرتی تو ٹھیک تھا میں نے کب تم سے تمہاری الفت کا تقاضہ کیا تھا؟ تم مجھ سے بے رخی کا رشتہ ہی سہی ایک تعلق قائم تو رکھتیں؟ تم مجھ سے نفرت کرتیں مگر خود سے تو دونا نہ جاتیں مجھے تمہاری سنگدلی اپنے لئے نہیں؟ تمہارے لئے تڑپاتی ہے تم مجھے نہیں جن سکتی تھیں کم از کم ایسے شخص کو تو ہمسرا بنائیں جو تم سے وانا نہ کرنا تو تم سے نفرت ہی کرتا؟ تم نے محبت کھونے کے ذرے سے نفرت پانے کے ذرے سے ایسے شخص کو کیوں جن لیا جو محبت، نفرت، رشتوں ہر ایک لطافت سے محروم ہے؟ کیوں؟ کیوں؟ کیا کیوں تم نے خود کو سزا دی؟ مجھے اس قابل نہیں سمجھتی تھیں میری چائیں تمہاری نگاہ میں بے مول تھیں تو تم خود کو تو بے مول نہ کرتیں؟ تم سے بچ کر جیوں۔۔۔۔۔؟ تمہارے غموں کو سینے سے لگا کر جیوں۔۔۔۔۔؟ تمہاری سنگدلی کے سنگ جیوں۔۔۔۔۔؟

یا تمہاری ادا اسی تمہارے آنسوؤں کی جل تھل تمہارے دکھوں کی دھوپ کو عسوس کر کے جیوں۔۔۔۔۔؟ تم نے تو مجھے جیتے جی مار ڈالا ہے؟ میں نہ ہنس سکتا، دوں نہ ہی رونے کے قابل رہا، تمہارے غموں پہننے کے لئے دل کہاں سے لاؤں اور تمہارے دیئے دکھوں پر رونے کے لئے آنسو جمع کروں تو کہاں سے۔۔۔۔۔؟ تم نے مجھ سے رونے کی حسرتیں ہی چھین لی ہیں؟ تم نے کیوں کیا ایسا ایک بار تو مجھے بتاؤ؟ مجھے تم اس قابل بھی نہیں سمجھتی کہ میری دقاؤں پر یقین کر ڈیجئے اپنے دکھوں کی چادر تلے کھڑا نہ کر سکو تو مجھے اس چادر سے غموں کی چھایا بنانے کا رتی برابر ہی سہی ہوتی دے دو۔۔۔۔۔ زہیر اسے کاغذ سے تھامے، جھنجھوڑ رہا تھا، اور وہ اس کے سینے سے لگی بلک اٹھی تھی۔

”مجھے معاف کر دو زہیر! میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی تو کبھی جیشید سے شادی کرنے کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا، میں تو جیشید کی راند سے شادی کا سن کر ہی کانپ گئی تھی۔۔۔۔۔ وہ جو بے اختیاری میں اس کے سینے سے جا لگی تھی اب کچھ شرمندگی سے اسے کچھ ٹائٹل پر کھڑی کہہ رہی تھی۔

”وہی تو جانا چاہتا ہوں! کیا! کہ تم مجھ سے شادی کس وجہ سے نہیں کرنا چاہتی تھیں؟ تمہیں میری ماں سے نفرت ہے کیونکہ وہ تم سے نفرت کرتی ہیں تم دونوں کی یہ کیسی نفرت تھی؟ جس کا اثر میری ذات پر پڑا ہے اور جب تم ماں کی بھونٹیں بننا چاہتی تھیں تو کیوں تم نے مجھے ٹھکر کر جیشید کو چنا؟ وہ بھی تو اسی عورت کا بیٹا ہے جس کا بیٹا ہونے کی سزا تم مجھ کو دے رہی تھیں جب تم مجھے نہیں اپنا سکتی تھیں تو کیوں جیشید کی دہن بن کر میرے زخموں پر نمک چھڑکنے چلی آئیں۔۔۔۔۔؟“ وہ بہت درشتی سے کہتا اسے بے بسی سے رونا دیکھنے لگا تھا۔

”زہیر! تم سے شادی نہ کرنے کی وجہ پچھو نہیں پتا جانی تھے پتا جانی مجھے اپنے بیٹے کا قاتل سمجھتے ہیں وہ مجھ سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتے تھے بچپن سے میں ان کی توجہ کے لئے ترس رہی تھی میں پہلے ہر وہ کام کرتی تھی جو پتا جانی کو پسند تھا تاکہ اس طرح میں ان کی نظروں میں آ جاؤں مگر جب مجھے ناکامی ہوئی پتا جانی کی نفرت بڑھتی چلی گئی تو میں نے ان کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ہر وہ کام کیا جو انہیں ناپسند تھا اور وہ کام کرنے چھوڑ دیئے جو ان کے پسندیدہ تھے؟ میں نے ہر اس شخص سے ہیر پاندہ لیا جسے پتا جانی کی توجہ اور محبت حاصل تھی پتا جانی تمہیں اپنا بیٹا سمجھتے ہیں اور وہ اپنی ماں کے بعد کسی سے محبت کرتے ہیں تو وہ تم ہو کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔۔۔۔۔ وہ روتے ہوئے بول رہی تھی اور وہ خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔

”تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے اور پتا جانی کو تم اتنے عزیز تھے کہ وہ کبھی انکار نہ کرتے اور میں چاہتی تھی کہ تم اپنا پر پزل بھیجو تاکہ میں انکار کر سکوں مگر پچھو! دادی ماں نے میرا پر پزل تمہارے لئے نہیں جیشید کے لئے دیا اور پتا جانی نے سوچے سمجھے زہیر! سو جان کر ڈانٹا اور پر پزل ایکسپٹ کر لیا مگر سو جان نے وایا

پتا دیا تب پتا جانی کو احساس ہوا کہ دادی ماں نے کس کا نام لیا ہے وہ کبھی انکاری ہو گئے مگر میں نے اس وقت اپنے پتا جانی کی نگاہ میں پہلی دفعہ خود کو آتے دیکھا تھا ان کی آنکھوں میں صاف لکھا تھا کہ وہ اپنے جیسی دکھنے والی بیٹی کو کبھی ایک پاگل سے نہیں بیاہیں گے انہیں یہ اور اک اس لمحے ہوا تھا کہ میں ان کے جیسے دکھتی ہوں اور میں جو اس حقیقت کو جانتی تھی بالکل ان کے جیسی ہی بن گئی! سو جان نے مجھے بہت ڈانٹا مارا بھی مگر مجھے میری ضد سے نہیں ہٹا سکیں دادی ماں نے پچھو اور نکاح خواں کو بالیا اور میں تو صرف یہ سن کر ہی خوش ہو گئی تھی کہ پتا جانی نے نکاح خواں کو واپس بھیجنے کی بات کی تھی اور مجھے لگا تھا کہ میں 22 سالوں بعد اپنے پتا جانی کی نگاہ میں سامنے ہوں مگر میں غلط تھی زہیر! پتا جانی کی آنکھوں میں صرف ان کی ماں کے لئے محبت اور عقیدت بہتی تھی اور جب دادی ماں نے صرف اپنی بات خراب ہونے کے ذریعے اپنی جان لینے کی بات کی تو وہ بیٹی کو قربان کر گئے میری خوش فہمیوں کے عمل میری آنکھوں کے سامنے بکھرتے چلے گئے اور میں نے نکاح نامے پر سائن کر دیئے دادی ماں نے ایک ہفتہ بعد ہی رخصتی کی بات کی! سو جان کے ساتھ پتا جانی بھی انکاری ہو گئے مگر میں نے اس بار پھر دادی ماں کا ساتھ دیا اور سو جان نے مجھے اپنے گھر سے نکال باہر کیا! سب مجھے بے حس اور خود مر سمجھتے ہیں مگر تم بتاؤ زہیر! میں بے حس کیسے ہوں۔۔۔۔۔؟ بے حس تو دادی ماں نے دکھائی تھی میرا نکاح ایک پاگل سے پڑھاتے ہوئے بے حس تو پچھو نے دکھائی مجھے اپنے بونہار بیٹے کے لئے دھنکار کر اپنے اہنارل بیٹے کی بیوی بنا کر بے حس تو پتا جانی نے دکھائی اپنی سگی اولاد کو کسی بوجھ کی طرح ایک ادھورے شخص کے ساتھ رخصت کر کے بے حس تو سو جان نے دکھائی مجھے دھکے مار کر اپنے گھر سے نکال دیا! بے حس تو یہ سب لوگ تھے میں کہاں سے بے حس ہوں۔۔۔۔۔؟ کیا یہ سب چاہتے تو مجھے روک نہیں سکتے

تھے۔۔۔۔۔؟ مگر کسی نے مجھے روکنا ہی نہیں چاہا کسی نے اپنی نفرت نبھائی تو کسی نے بے زاری کسی نے مجھ سے جان چھڑائی تو کسی نے اپنی بھوری کا توک میرے گلے میں ڈال دیا اور میں پھر بھی بری کی بری رہی۔۔۔۔۔ وہ زمین پر بیٹھ کر رونے لگی تھی۔

”بیبا! ماسوں جان کا رویہ صرف تمہارے ساتھ برا نہیں تھا، وہ راندہ اور راعیہ کے لئے بھی ایک سرد مہر باپ تھے ان دونوں نے ماسوں جان کی سرد مہری سے کپڑا مارت کر لیا راندہ خود میں قید ہو کر رہ گئی اور راعیہ نے باپ کی جھڑکیوں کے باوجود ان کا پیچھا نہ چھوڑا وہ ان سے ڈرنے کے باوجود بھی ان سے فرمائش کیا کرتی تھی جسے ماسوں جان اکثر پورا بھی کر دیا کرتے تھے آج تم جو اتنی تنہا، وہ صرف اپنی حدود درجہ حساسیت کی وجہ سے ہو یہ ٹھیک ہے کہ جب ہمیں ہمارا حق نہ ملے تو ہمیں چھین کر لینا چاہئے مگر تم صرف بری بنتی چلی گئیں تم نے کبھی اپنا حق چھیننے کی کوشش ہی نہیں کی؟ میں ماسوں جان کو سمجھ نہیں کہہ رہا مگر وہ جتنا تمہاری شخصیت کو سخ کرنے کے ذمہ دار ہیں اسے کتنی زیادہ خود تم تصور دار ہو۔۔۔۔۔ زہیر! اس کے عین سامنے بیٹھا تھا اور وہ اسے بے یقینی سے دیکھنے لگی تھی۔

”سب نے تمہیں منحوس قرار دیا اور تم نے یہ بات اپنے لاشعور میں قید کر لی تم نے کبھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی کہ تم منحوس نہیں ہو زندگی اور موت کے فیصلے آسمان والے رب کے ہاتھوں میں ہیں؟ تم نے اپنی زبان کو زہر خند بنا کر اپنی خوبیوں کو خامیوں تلے دبا کر خود اپنے ساتھ زیادتی کی ہے؟ ممانی جان! میں سیکڑوں خوبیاں ہیں مگر ماسوں جان اور نانی ماں ان کی کسی نہ کسی ایک مارہ کو پکڑے ان کی خوبیوں کو نظر انداز کرتے چلے گئے اور انسان کو اس کی خوبیوں سے جانا جاتا ہے نالی ماں منہ سے اعتراف نہ کریں مگر وہ بھی ممانی جان کی خوبیوں کی معترف ہیں اور آج تک ممانی جان اپنی گراستی کو لے کر چل رہی ہیں تو وہ

مطمئن نہ آج ہونہ ہی کل ہوتی مگر ایک دن تو ایسا آتا کہ جس میں مکمل اطمینان نصیب ہوتا تھا۔ تم سے نفرت کرنے والے تم سے شرمندہ ہو کر اپنے اندر چھپی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ تمہاری خود ساختہ نفرت تمہیں محبت سے بہت ہی دور کر گئی۔ زہیر اس کی سن کر اپنی کہہ کر جب کر گیا تھا مکمل خاموشی میں اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں اور وہ بے بسی سے اسے روٹا دیکھ کر اڑاؤنے لگا تھا مگر اس کی آواز پر چاہیں بیٹہ کر بغور اس کے سے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگا تھا۔

.....

”زہیر! جب تم مجھے اتنی اچھی طرح سے جانتے تھے جب تم میری سوچوں تک سے واقفیت رکھتے تھے تو کیوں نہ مجھے روک لیا۔“

”بابا!۔۔۔ میں زعم تو مجھے لے ڈوبا ہے بابا! وہ خود پر ہنس رہا تھا اور وہ نکر کر اسے دیکھ رہی تھی۔“

”بابا! میں تم سے جانے کب سے محبت کر رہا تھا شاید جب بھی تمہیں میں چاہتا تھا جب محبت کی جہوں سے بھی نادانف تھا مگر ایک لمحہ ہوتا ہے جو ہمیں شناسا کی دلچیز عیور کر دیتا ہے اور وہ لمحہ تو میں تاحیات بھول ہی نہیں سکتا اور نہ ہی تم بھول سکتی ہو۔ وہ بہت یقین سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس نے پلٹیں جو کاوی تھیں اور وہ اتنی دیر میں پہلی دفعہ مسکرایا تھا۔“

”بابا! تمہاری یہی پلٹیں مجھ سے کہہ رہی ہیں جس میں وہ لمحہ یاد آ گیا ہے جس لئے بے قراری سے ہمارے سبھے میں نے اپنے لب تمہاری بے داغ پیشانی پر رکھ دیئے تھے اور مجھے ادراک ہوا تھا کہ میں کب سے تیرا تھا اور میری چاہت کا سمندر تمہاری ذات میں جیسے مکمل ہو گیا تھا اس لمحہ نے مجھے میری چاہت سے آشنائی دی تھی تو تم اس لمحہ کی اسیر ہو گئی تھیں میری محبت کا اقرار نصیب ہوا تھا تو تم محبت کے سفر پر گامزن ہو گئیں تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے روٹاؤں آکھیں موندے ایک ہی نظر میں کھوئے ہوئے تھے

ان کی خدیوں کا شائسانہ ہے مگر تم نے ان کی خاموشی کو ان کی برادری و سمجھداری کی بجائے کمزوری سمجھا جس میں لگتا ہے کہ ممانی جان ممانی ماں کے مقابلہ خاموشی سے نہ برداشت کرتیں تو۔ ماموں جان کا تم اوگوں کے ساتھ رو یہ کچھ ڈیفرنٹ ہوتا مگر تم غلط سوچتی ہو بابا! جو برسوں سے ماموں جان کو دکھایا جا رہا ہے وہ مجھے اور تم کو بھی دکھایا جا رہا ہے مگر تم کیوں ممانی ماں کے خلاف اور ممانی جان کے ساتھ ہو جھگڑے کیوں ممانی جان پوری طرح غلط نہیں لگتیں وہ اس لئے بیا کہ تصویر کے دور رخ ہوتے ہیں اور کچھ لوگ دونوں پہلوؤں پر غور و بحث کرنے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں اور بعض لوگ اپنی آنکھیں اور کان بند کر لیتے ہیں اور دوسروں کی ہر غلط بات پر بھی ایمان لاتے چلے جاتے ہیں اور ماموں جان کا تعلق اسی آنکھوں کے اندھے اور کانوں کے بہرے گروہ سے ہے اور ممانی جان اگر مصلحت پسندی کے تحت خاموشی اختیار نہ کرتیں تو جو بات صرف گھر کی چار دیواری تک مقید ہے وہ ایک زمانے کی زبان پر گردش کر رہی ہوتی ممانی جان اگر ممانی ماں سے مقابلے پر اتر آتیں تو تمہارا گھر اکھاڑا بن جاتا ماموں جان جو ممانی جان کو غلط اور اپنی ماں کو درست سمجھتے ہیں تو وہ بھی ان دونوں کی آپسی چیلنج کا شکار ہوتے کبھی ممانی جان کا پلڑا بھاری ہو جاتا تو کبھی ممانی ماں جیت کی مشق ٹھہرتیں مگر اب کم از کم ہر طرف ممانی ماں کی جیت کا ڈنکا ہے تو شعور میں ممانی جان کی خوبیاں اپنا آپ منوار ہی ہیں اور خوبیوں کا ہونا اور دوسروں کا انہیں تسلیم نہ کرنا وہ الگ الگ باتیں ہیں اور تم نے لوگوں کے اپنے ساتھ برے رویوں کو اپنے اوپر اس قدر حاوی کیا کہ تم سر اپنے برائی بن گئیں تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ برائی کو برائی سے نہیں اچھی سے مارا جاتا ہے اور جب تم نے لوگوں کے رویے لوگوں کو اوجا تا شروع کیے تب بھی تم ہی لیو لیو ہو گئیں کیونکہ تمہارے اندر کی اچھی لڑکی اپنی موت برداشت نہیں کر پار ہی تھی تم

سچا تھا اور نہ تمہیں سہی ضرور سکھاتا۔ وہ اپنی نون میں بولا تھا اور وہ اپنے آنسو صاف کرتی رہاں سے نکلنے لگی مگر ایک بار پھر وہ اس کی نکائی تمام کیا تھا۔

”بابا! تمہیں جیشید کی بیوی کے روپ میں دیکھ پانا میرے لئے ممکن نہیں ہے مگر میں اس حقیقت کو مستحق سے نہیں مٹا سکتا تم میرے لئے کل بھی قابل احترام تھیں اور آج تو تم سے کچھ ایسا رشتہ ہے کہ میں خود کو تمہارا احترام کرنے اور بھول جانے کا پابند سمجھتا ہوں اور تمہاری نگاہ کے سامنے رہ کر نہیں بھول جاتا میرے بس میں نہیں ہے اس لئے میں نے اپنا پنڈی میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ وہ اسے بے چینی سے دیکھ رہی تھی اور آنسوؤں پر قابو نہ رہا تھا۔

.....

”مبارک ہو بابا! اگلے ماہ کی گیارہ کو تم ہمیشہ ہمیش کے لئے دبیح کھن کی ہو جاؤں گی۔“ سید نے مٹھائی کھاتے ہوئے شرارت سے کہا تھا۔

”ارے بابا! روٹنے کیوں لگیں چندا۔“ راندہ نے اسے گلے لگاتے ہوئے پکڑا رکھا تھا۔

”بھیا! بابا بہت یاد آ رہی ہیں۔“ وہ روتے ہوئے بولی تھی اور راندہ کچھ نہ بول سکی تھی۔

”بھیا! بابا! جان نے کیوں اس گھر کے دروازے سے بھا پر بند کر دیئے ہیں۔“ نچر گیا اپنی بیٹی کی آواز پر وہ راز سے سے ہی پٹ گئی تھیں جبکہ راندہ بھی خاموش ہو گئی تھی۔

.....

”زہیر! میری ونہ سے جس میں اپنا گھر چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے تم اس گھر کے بیٹے ہو اور پھپھو تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔“

”میں رکنے بلاناؤں میں بابا! اور یہ میری ماں کی مجھ سے کیسی محبت تھی کہ اس نے چاہتے ہو جھتے ہوئے میری خوشیاں چھین لیں ماما! وہ اپنی خوشی کے لئے خود کو قربان کر دینے کا ظرف رکھتی ہے مگر میری ماں نے

”جب جب تم مجھ سے نفرت! بے زاری کا اظہار کرتیں میں تم کو اور مزید تنگ کرتا جاتا تھا۔“ چہرے پر فحش اور آنکھوں میں سرنی، بڑی جھجے بہت اچھی سہی تھی۔ وہ جال میں لوٹتے ہوئے اس کی طرف رخ موڑ گیا تھا اور اس نے جلدی سے اپنی پیشانی پر سے ہاتھ ہٹایا تھا اور اس کے لبوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور وہ خفت زدہ ہو گئی تھی۔

”تم اپنی نفرت کی ناؤ میں بہ رہی تھیں اور میں نے محبت کے دیئے اس کے گرد روشن کر دیئے تھے مجھے لگتا تھا کہ میری محبت تمہاری اوپری اوپری ہی نفرت کو فنا کر دے گی مگر میں خود غنا ہو گیا تمہاری ضد کبوں یا تمہارے اندر کی اس عروم لڑکی اس معدوم بچی کی تڑپ جو ہر حال میں اپنے باپ کی نگاہ میں آنا چاہتی تھی اور اس چاہ میں اپنی محبت ہی کھو بیٹھی اور یقین کر دیا! تمہارے منہ سے سننے بغیر بھی میں وقت تھا کہ تم نے یہ قدم کیوں اٹھایا تھا میں تو تمہیں بس کچھ بولنے کا موقع دینا چاہتا تھا کیونکہ جاننا ہوں میں کہ سارہ تمہاری بیسٹ فرینڈ ہے مگر تم نے کبھی دل کی بات کبھی اسے بھی نہیں کی کیونکہ تم کسی پر اعتبار کرتی ہی نہیں نہ وہ اور مجھے ڈر تھا کہ تم اندر ہی اندر حقیقت کہیں میری نظروں سے اوجھل نہ ہو جاؤں اور میں تو ہمیشہ تمہارے لئے دھاگوں ہی رہا ہوں یہ اور بات ہے کہ نہ تمہارے ساتھ کی دما قبول ہو سکی اور نہ ہی تمہاری خوشیوں کی تم جیشید کی بجائے دبیح سے شادی کر لیتیں تو میں کچھ مطمئن ہو جاتا۔ وہ اس کے من سے بیٹا من کا نام سن کر چونک نہ سکی۔

”بابا! تم نے اپنی اچھی نیچہ۔۔۔ رت تمہیں ہوئی تھی میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ رتہ کون آیا کون گیا جس میں خبر نہ ہو ڈنک ہو جا کر کرتی تھی اور ان دونوں تم بہت ڈنک رہا کرتی تھیں مگر تم نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا تھا وہ بے ضرر سا بندہ۔ تم نے کیا کچھ کہہ ڈالا تھا اور وہ بھی میری طرف تم سے ہوتی محبت میں

مجھے میری محبت سے جدا کر دیا۔ اس کے لہجے میں بے بسی اور ماں کے لئے بدگمانی تھی۔

”زبیر! تم پھپھو کے لئے نہ سہی احمد اکل کے لئے رک جاؤ وہ تو تم سے بہت محبت کرتے ہیں اور سید سمید۔“

”یہاں میں تمہاری ان کہی کے مجید سے ناواقف نہیں ہوں مجھے میرے رشتوں کے جال میں مقید کر کے روکنا چاہتی ہو مگر میرا فیصلہ اٹل ہے اور مجھے تمہاری محبت بھی نہیں روک سکتی مگر میں ہمیشہ کے لئے نہیں جا رہا کچھ دنوں میں لوٹ آؤں گا مگر ابھی نہیں خبر سکتا۔“

زبیر اس کی غم چکوں میں جھانکتا اس کی کلائی آزاد کر گیا تھا وہ پلٹنے کو تھا کہ ان دونوں کے کانوں میں کسی کی چیخ ابھری تھی۔

”ماں... ماں... وہ دونوں ایک ساتھ ہی باہر کی جانب دوڑے تھے بیا جمشید کے روم میں گئی تھی مگر جلد ہی لوٹ آئی تھی۔

”زبیر! آواز تو جمشید کی تھی مگر وہ...“ بیا کی بات سنا کر زبیر کے پاس زخمی پڑے جمشید کو دیکھ کر وہ گئی تھی اس نے بے ہوش بھائی کو گود میں اٹھایا تھا اور باہر کی جانب بڑھا تھا تسبیح بھی اس کے پیچھے لگی تھی۔

”زبیر! یہ تو سوراہا تھا وہاں سیر میوں کے پاس۔“

”ریشم! بیا! جمشید کو کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے ڈرامہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”پیشہ کے خون بہت بہہ گیا ہے ان کا بچنا بہت مشکل ہے ان کا دماغ جیسے بالکل بھی کام کر رہی نہیں رہا پھر بھی آپ دعا کریں۔“ ڈاکٹر پیشہ دارانہ انداز میں کہتا آگے بڑھ گیا تھا اور اس نے ان سب کو بلا لیتا ہی مناسب سمجھا تھا۔

”ہیلو بابا! جمشید سیر میوں سے گر گیا ہے میں اسے ہسپتال لے آیا ہوں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“

اس نے باپ کو تسلی دی تھی مگر کچھ ہی دیر میں وہ سب کتے سب ہسپتال پہنچ گئے تھے۔

”زبیر! کہاں ہے میرا بیٹا! وہ کیسے سیر میوں سے گر گیا تم نے خیال کیوں نہیں رکھا اس کا“ میں تم سے پوچھ رہی ہوں بیا! وہ جگہ کا خیال کے بغیر اس پر برس رہی تھیں اور نچر گیا ان کی کا دل کٹ کر رہ گیا تھا بیٹی کو اتنے دن بعد دیکھ کر مگر وہ بولی کچھ نہیں تھی وہ سب باہر کھڑے جمشید کی زندگی کی دعا مانگ رہے تھے آئی سی یو کا دروازہ کھلا تھا اور ڈاکٹر ان سب کے نزدیک آ رہا تھا رضیہ بانو بہت امید سے انہیں دیکھتے ہوئے بیٹے کی خبریت پوچھنے لگی تھی۔

”ڈاکٹر... کیسا ہے میرا بیٹا! ٹھیک...؟“

”آئی ایم سوری...“ وہ ڈیوڈ ڈاکٹر کی بات ان سب پر بجلی گرا گئی تھی رضیہ بانو تو دیوانوں کی طرح آئی سی یو کی جانب بھاگی تھیں اور بیویں میں جکڑے بیٹے کو جھنجھوڑنے لگی تھیں۔

”جمشید... اٹھ جینا آ نکھیں کھول اپنی ماں سے بات کر۔“ وہ رو رہے تھے کہہ رہی تھیں مگر ماں کو دیکھ کر تالیاں پیٹنے والا اور کھی کھی کرتا ماں سے لپٹ جانے والا جمشید احمد اس وقت ساکت لیٹا تھا اور ان کے تین پورے ہسپتال میں گونجنے لگے تھے زبیر نے ماں کے کاندر سے ہاتھ رکھا تھا اور وہ بیٹے کے سینے سے لگیں اور بلند آواز میں بلکنے لگی تھیں اس نے ماں کو چپ کر دیا تھا اور جیسا ان کی نگاہ پر پڑی تھی اور وہ کسی ٹیل کی طرح اس پر جھپٹ پڑی تھیں۔

”یہ... یہ منھوس کھا گئی میرے بچے کو پیدا ہوئی تو ڈان اپنے بھائی کو نگل گئی میرے بچے کے ساتھ اس ہنر قدم کا نام کیا جڑا میرا بھنا چکا بیٹا مجھے چھوڑ گیا۔“ رضیہ بانو اسے بے دردی سے لائیں اور گونسیں ماریں جو منہ میں آ رہا تھا کہے جا رہی تھیں اور یہ سب نچر گیا ان سے برداشت نہیں ہو سکا تھا وہ اپنی بیٹی کو بچانے کے لئے آگے بڑھی تھیں مگر رضیہ بانو تو پھری ہوئی تھیں بیٹی ہوئی تھیں انہیں دھکا دے کر وہ اس پر ایک بار پھر جھپٹ پڑی تھیں زبیر نے بہت مشکلوں سے اسے ماں کی

گرفت سے نکالا تھا۔

”چھوڑو زبیر! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی“

اسی نے میرے جمشید کی جان لی ہے اور اس کی جان... رضیہ بانو بیٹے کے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں اس نے انہیں بہت مشکلوں سے سنبھالا ہوا تھا ڈاکٹر ان کی چیخوں کی آواز پر آ کر انہیں ڈپٹنے لگا تھا اور زبیر انہیں کانی سمجھا بچا کر باہر کی جانب لے جا رہا تھا ہیل گیلانی جمشید کی ڈیڈ باڈی لے جانے کے انتظامات کرنے لگے تھے اور کچھ ہی دیر میں جمشید کو اس کے آخری سفر پر لے جایا گیا تھا اور اس کے اپنے اسے منوں مٹی تلے دفن کر کے نڈھال سے لوٹ آئے تھے رضیہ بانو تو غم سے ادھ موٹی سی ہو گئی تھیں تسبیح جس نے فقط دو ماہ قبل اسے جمشید کے حوالے سے جمشید کا بیچ (اپنے گھر کا نام رضیہ بانو نے بیٹے کے نام پر رکھا تھا وہ چاہتی تو اپنے سب بچوں کو بے حد دے حساب تھیں مگر جمشید کی دماغی حالت کی وجہ سے وہ اس پر خصوصی توجہ دیتی تھیں اور کوئی اسے ابھارل کہتا تھا تو وہ مارنے مرنے پر آمادہ آتی تھیں) میں لایا گیا تھا وہ تو رشتوں اور اس کے مطلوبہ سے ہی نابلد تھا مگر وہ دنیا دکھا دے کوئی سکی جمشید کی دلہن تھی اور اب وہ نہیں رہا تھا رضیہ بانو نے بخوبی انداز میں اس کی دونوں کانٹیاں پکڑ کر زمین پر دے ماری تھیں اور جہاں سرخ چھوڑیاں اپنی ناقدری پر بکھرتیں چلی گئی تھیں کچھ اس کی گلابی کانٹوں میں بھی کھب سی گئی تھیں اور خون رسنے لگا تھا مگر رضیہ بانو اس کی تکلیف کا احساس کئے بغیر اس کے کانوں میں سے ناہنس نکھینے لگی تھیں اس نے سسکیاں دباتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر خود ہی ناہنس اتار دیے تھے اور انہوں نے اس کے گلے میں پڑی سوئے کی جھین کچھ اس انداز سے کھینچی تھی کہ وہ نوٹ کر اس کی دو دھیاں گردن کو زخمی کرتی اس کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور رضیہ بانو کے پیچھے کو اتنا سب کرنے پر بھی خند تک نصیب نہ ہوئی تھی وہ اب اسے بے دردی سے پیٹنے لگی تھیں۔

”رضیہ میری بچی ۱۰۰ ہوش میں آ کیا جان لے لے گی اس کی۔“ انیسے پیاسم نے آگے بڑھ کر بیٹی کو روکا تھا اور وہاں کے سینے سے ہگ کر بلکنے لگی تھیں۔

”اماں! سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے اس منھوس سے میرے بچے کی تم نے ہی شادی کروائی تھی کاش میں تمہاری باتوں میں نہ آتی تو کم از کم میرا جمشید تو زندہ ہوتا یہ جہنم چلی کھا گئی اس کو... ہائے میرا لال! میں نے کیوں اس لائن پر بھروسہ کیا... ہائے اماں! میں لٹ گئی... میں برباد ہو گئی... میرا معدوم بچہ اس منھوس کے سبز قدموں کی نظر ہو گیا۔“ رضیہ بانو اول فول تھیں پھر اس پر چھٹی تھیں مگر اب کے نچر گیا انی نے اسے اپنے بازوؤں میں پیچ لیا تھا۔

”بس... رضیہ ہائی! بہت بد اس من لی میں نے آپ کی... اب میری بچی کو ایک لفظ مت کہئے گا...“ وہ رو رہے تھے اتنا ہی بولی تھیں کہ رضیہ بانو اپنے آنسو صاف کرتی انھی تھیں اور تسبیح کو بازو سے تھام کر زبردستی کھڑا کیا تھا۔

”نچر! یہ تمہاری بیٹی ہے نہیں تھی... اسے بہو بنا کر لائی تھی اذراب یہ ماری زندگی میرے بیٹے کی بڑھ بن کر اسی گھر میں رہے گی۔“ وہ اسے ٹھیکتے ہوئے اندر لے گئی تھیں۔

”بھائی! رضیہ کے سلوک کی آپ سے میں معافی مانگتا ہوں بیٹے کی موت کے غم نے اسے پاگل کر دیا ہے۔“ کب سے خاموشی سے تماشہ دیکھتے احمد صاحب نے نچر گیا انی کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔

”بھائی صاحب! آپ کے معافی مانگنے سے کیا ہوگا۔؟ رضیہ باجی نے تو کوئی کسرت نہیں چھوڑی مگر میری بچی کو کچھ ہو گیا تو میں نیل! آپ سب سے کسی کو بھی نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ سانس اور شور مچا کر گھورتی روئی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھیں اور ان کے پیچھے ہی رابعیہ اور نیل گیلانی بھی جمشید کا بیچ سے نکلتے چلے گئے تھے رابعیہ اور ڈیشان تو اس تماشے سے قبل ہی چلے گئے

تھے کیونکہ رات کی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی، تسبیح دیکھتے
وہ رات کے ساتھ ساری رات زمین پر بیٹھی روتی رہی تھی
اسے جمشید کی موت کا دکھ تھا اور وہ اپنی نالہ روی پر آنسو
بہا رہی تھی اور مستقل رونے اور بچنے کے بعد ٹھنڈے
نرش پر بیٹھے رہنے کے نتیجے میں وہ صبح تک بخار میں مل
رہی تھی اور اس پر فیوڈ کی طاری ہو گئی تھی نماز کے لئے
انہیں زہیر نے اسے اتنی ٹھنڈ میں زمین پر بیٹھے دیکھ اس
کے روم میں قدم رکھا تھا زہیر نے دو چار آوازیں دینے
کے بعد اس کا کاندھا ہلایا تھا اور اس کے ایک جانب
لڑھک جانے پر نگر بندی سے اس پر جھکا تھا تو اس کو
احساس ہوا تھا کہ وہ بخار میں تپ رہی ہے اس نے
جلدی سے اپنے خیالی ڈاکٹر کا نمبر ملا لیا تھا اور ڈاکٹر سیہ کو
بلا لایا تھا ڈاکٹر نے اسے سکون کا انجکشن لگاتے ہوئے
ٹھنڈ سے پانی کی چٹیاں رکھنے کی ہدایت کی تھی اور
دوا میں لانے کا کہنا دیا پس چلا گیا تھا۔

"سوئی اتم چٹیاں رکھتی رہو میں دوائیں لینے جا رہا
ہوں کوئی نہ کوئی میڈیکل اسٹور تو کھل ہی گیا ہوگا۔" وہ
بہن سے کہتا اپنے روم میں آیا تھا اور گاڑی کی چابی اٹھا
تا باہر نکل گیا تھا سورج ابھی اٹکا نہیں تھا کافی اندھیرا
تھا ایسے میں کوئی میڈیکل اسٹور کھلا دوا خانہ نہیں آ رہا تھا
کافی دیر بعد اس کی آنکھ ایک چھوٹے سے میڈیکل
اسٹور پر پڑی تھی جسے اس کا مالک کھول رہا تھا اس
نے گاڑی سے اتر کر مطلوبہ دوائیں طلب کی تھیں
"وائے ایک ٹیبلٹ کے لئے" مطلوبہ میڈیکل گئی تھیں
اور وہ گاڑی میں آ بیٹھا تھا اور جس وقت اس نے گاڑی
گھر کی طرف موڑی سورج نکل چکا تھا اس نے گھر کے
نزدیکی اسٹور سے وہ ایک گولی بھی لی تھی اور گھر
آ گیا تھا۔

"سوئی کچھ بند رکھ دو؟" اس نے روم میں
داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اوہ ہوں۔ پہلے سے کم ہے۔" وہ اس کے ماتھے
پر تویہ بٹائی برف کھلے پانی میں ڈب کر کے ایک

بار پھر اس کے ماتھے پر رکھ چکی تھی۔

"بیا کی اس حالت کی ذمہ دار صرف اور صرف ماما
ہیں۔۔۔ انہوں نے بیا کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا جمشید
بھائی کی موت کی بیا تو ذمہ دار نہیں ہیں مگر مستقل
انہیں چرچہ۔۔۔" وہ بہت دکھ سے بھائی سے مخاطب
ہوئی تھی اور زہیر کے جواب دینے سے قبل اس نے
آنکھیں کھول دی تھیں۔

"اوہ۔۔۔ تھینک گاڈ بیا! آپ کو دوش تو آیا میں
تو بالکل ڈر رہی تھی۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرا کر
بولی تھی۔

"تم بھائی بہن۔ اس منہوس کی ناز برداریوں
میں گئے ہو جو میرے جوان جہان بیٹے کو کھائی۔" رضیہ
بانو روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"اوہ۔ پلیز ماما! کچھ تو خیال کریں یہ منہوس
انوس کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ زندگی اور موت کے فیصلے تو
اللہ۔۔۔ وہ بیٹی کو خوشگیس نکالوں سے گھورتی نگ میں
نوکتی اسے نفرت سے دیکھنے لگی تھیں۔

"مجھے معلوم ہوتا کہ یہ جنم جلی مجھ سے میرا بیٹا جھین
لے گئی تو کبھی بھی اسے اپنی بہن نہ بناتی۔" وہ اب بے
بسی سے رونے لگی تھیں۔

"اماں! ایسا کیوں سوچتی ہیں کوئی انسان کسی کا
مقدور نہیں چھو سکتا اور نہ زندگی اور موت کے فیصلے
کر سکتا ہے ہمارے جمشید کی بس اتنی ہی زندگی تھی اور
آپ بیا کو کوسنے اور اسے منوس کہنے میں وقت ضائع
کرنے کی بجائے اپنے بیٹے کے لئے دعا کریں وہ تو
اب تک آپ کی انگلی پکڑ کر چلتا تھا اسے آپ کی
دعاؤں کی ضرورت ہو گئی اور اسے آپ کے رونے سے
تکلیف ہو رہی ہوگی۔" اس نے دل گہرائی سے کہتے
ہوئے ماں کے آنسو پونچھے تھے۔

"زہیر! میرا جمشید۔ اسے اندھیرے سے بہت
ڈر لگتا تھا وہ تو میرے ہاتھوں سے کھانے کا عادی تھا اور
کل رات سے اس نے کچھ نہیں کھایا میرا جمشید بھوکا

ہوگا اسے اکیلے میں ڈر۔" وہ بیٹے کے کاندھے سے
گلی ہلکنے لگی تھیں۔

"اماں! حوصلہ رکھیں اور جمشید کی مغفرت کی دعا
طلب کریں۔" وہ ماں کو بیڈ پر بٹھاتے ہوئے پانی
پانے لگا تھا انہوں نے دو گھنٹہ ہی پانی پی کر اسے
ٹھکانا دیا تھا اور انہوں نے روتی ہوئی بیٹی کو
گلے سے لگایا تھا تسبیح ہال سینٹی اور آنسو صاف کرتی
بیڈ سے اتری تھی اور انہوں نے اٹھتے ہوئے کھانے کا قیام
کر اسے روکا تھا اور کچھ پل اسے دیکھتے رہنے کے بعد
اسے سینے سے لگایا تھا اور زور زور سے رونے لگی تھیں
وہ دونوں تو ماں کی حرکت پر حیرانگی سے رونا بھول گئے
تھے اور وہ ان کے سینے سے گلی ہلکنے لگی تھی۔

"مجھے حاف کر دیں پھپھو! میں جمشید کی حفاظت
نہیں کر سکتی مگر خدا اگر وہ ہے پھپھو۔۔۔ میں نے اس کی
جان نہیں لی وہ کب جیت پر چڑھا اور کب میز جیوں
سے گرا مجھے پتہ ہی نہیں چلا میں بہت بری ہوں پھپھو!
بہت بری مگر اب اتنی بھی نہیں کہ کسی کی جان لے
اوں۔ اور جمشید تو مجھے کچھ بھی نہیں کہتا تھا کبھی بیا۔۔۔ تو
کبھی دلہن دلہن۔۔۔ کہتا میرے آگے پیچھے۔" وہ ان
سے الگ ہوتے ہوئے انکیوں کے درمیان بول رہی تھی
مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ اسے خود
سے چٹا کر پیار کرنے لگی تھیں۔

"مجھے معاف کر دے۔۔۔ میں تجھے جانے کیا کیا
کے جارہی تھی تو تو میرے جمشید کی دلہن ہے وہ تجھے
دیکھ کر کتنا خوش ہوتا تھا بہن! دلہن کہہ کر ہنستا تھا اور
میں اپنے بیٹے کی دلہن کو۔۔۔ وہ اس کے چہرے پر ہاتھ
پھیر کر اس کے آنسو پونچھنے لگی تھیں اور اسے گلے سے
لگا کر ہلک اٹھی تھیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"امو جان! آپ بیٹے میں سالن بنالیتی ہوں۔"
مغرب کی نماز ادا کر کے وہ سیدھی بہن میں آئی تھی نجمہ
بیانی نے بیٹی کو مسکرا کر دیکھا تھا اور دھلے بیٹے

گوشت کا پیالہ سلپ پر رکھ دیا تھا۔
"امو جان! آپ مجھ سے ناراض۔" بیٹی کی
آواز پر وہ ہلٹی تھیں۔

"اماں! اپنے بچوں سے کبھی ناراض نہیں ہوتیں
اور میرے خفا ہونے کی تو کوئی وجہ بھی نہ تھی مگر جو
کچھ ہوا اسے بھول جاؤ اور ہاں۔ کل سے ہی
یونیورسٹی بھی جوائن کر لو۔ پہلے ہی بہت نقصان ہو چکا
ہے۔" وہ تسبیح کا گال شفقت سے تھپتھپاتیں بہن سے
نکل گئی تھیں اس نے کڑھائی گوشت کے ساتھ چاول
ابال لئے تھے اور دادی اور باپ کے لئے روٹیاں
ڈالنے لگی تھی اپنا سارا کام ختم کر کے وہ راعیہ کے
کمرے میں آئی تھی۔

"کس سے بات ہو رہی تھی۔" اس نے بہن
کو پھینرا تھا۔

"بیا! واقعہ تھے۔" راعیہ کے چہرے پر رنگ اپنی
بہادر دکھانے لگے تھے۔

"پتہ نہیں دو ریا کے ساتھ میریس بھی ہیں یا
وہ میرا بھلہ اس سے لینا چاہتے ہیں۔" اس نے بہن
کے چہرے کو دیکھ کر سوچا تھا مگر پھر خود کو فضول سوچوں پر
ڈبھتی اسے کھانے کا کبھی باہر نکل گئی تھی اور راعیہ بھی
اس کے پیچھے آ گئی تھی اور اب ٹیبل لگانے میں بہن کی
مدد کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"سمید! اگر نارغ ہو تو ماما کی لیماس لے آؤ میں
زہیر بھاسے کہہ دیتی مگر وہ ابھی تک آنس سے نہیں
آئے۔" سمید ناک کرتی اس کے روم میں آ کر بولی
تھی اور اس کا فادرل لب دلچہ کتاب پڑھتے سمید کو
چونکا گیا تھا۔

"مامی! لی سسر اس میں اتنی تمہید باندھنے کی
کیا ضرورت تھی اماں کی دوائیں لینے تو میں ضروری
سے ضروری کام چھوڑ کر بھی جاسکتا ہوں۔" وہ کتاب بند
کرتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔

"میں کوئی تمہید نہیں باندھ رہی تھی، تمہیں کتاب پڑھنے دیکھا تو خیال گزرا اب شاید تم نہ جاؤ۔" وہ صاف گوئی سے بولی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا۔

"سمید اتم مجھے بابا کی طرح نہیں لگتے تم میں ماموں جان کی نہ صرف شبابیت ہے بلکہ تم عادتوں وغیرہ میں بھی ماموں جان کی ہی کاپی ہو۔" سمید بھائی کو دیکھ کر جانے کیا سوچ کر بولی تھی۔

"اوہوں۔۔۔ کبھی کبھی مجھے بھی یہی لگتا ہے بٹ کیا کیا جاسکتا ہے میں اپنے بابا کی طرح دکھوں یا نہ دکھوں راتوں کا تو ان کا ہی بیٹا اور تم سڑی ہوئی میری اکلوتی بہن۔" اس نے جیسے ہوئے سمید کی بولی چھیٹی تھی۔

"خیر تو ہے سمید! بات بے بات مسکرا رہے ہو اور نہ تم تو عید الفطر پر مسکرا دیتے ہو تو عید الاضحیٰ کی سمجھو پھٹی۔" اسے حقیقتاً حیرت ہوئی تھی اور اس نے چھت پھاڑتے ہوئے بولا تھا۔

"میری بہن! اچھا مذاق کر لیتی ہے لاڈ کونسی دوائیں لاتی ہیں۔" وہ شرارت سے کہتا اس کے منہ بنتے دیکھو میری بس ہو گیا تھا اور وہ دواؤں کی پرچی اسے دیتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

"احسن۔۔۔ کیسا ہے پار۔۔۔؟ اوہوں گھر میں پور ہو رہا تھا مگر اب اماں کی دوائیں لینے جا رہا ہوں ٹھیک ہے آجامل کر شاپنگ کر لیں گے۔" گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے جیسے ہوئے موہن نے اپنا جانب متوجہ کر لیا تھا احسن کے بھائی کی شادی ہونے والی تھی اور وہ شاپنگ میں سمید کی ہیلپ کا خواہاں تھا اور اس نے بھی فوراً حامی بھر لی تھی ان دونوں نے جی بھر کر شاپنگ کی تھی اور باتیں کرتے ہوئے شاپنگ مال سے نکل آئے تھے۔

"بابے احسن۔۔۔ مجھے ابھی اماں کی دوائیں لینی ہیں۔" وہ احسن سے بولتے ہوئے مڑا تھا اور اپنا جھونک میں وہ سامنے سے آتی تیز رفتار گاڑی دیکھ نہیں پایا تھا اور کچھ ہی دیر میں وہ بے سدھ مزک پر پڑا ہوا تھا۔

احسن نے اسے گاڑی میں ڈالا تھا اور اس کے گھر کا نمبر ملانے لگا تھا جبکہ سمید کے سر اور ٹانگوں میں سے خون کافی تیزی سے بہہ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"پشٹ کا خون کافی بہہ گیا ہے بی پازلیج بلڈ اس وقت بلڈ پینک میں موجود نہیں ہے پشٹ کے قاتر یا پدر میں سے جس کا بھی بلڈ گروپ بی پازلیج ہے وہ پشٹ کو خون دے دیں ورنہ پشٹ کی جان بھی جاسکتی ہے۔" ڈاکٹر کہہ کر واپس آپریشن تھیز میں چلے گئے تھے۔

"رضیہ! میرا بلڈ گروپ اونٹینا ہے یقیناً تمہارا بلڈ گروپ ضرور سمید سے میچ کرے گا۔" احمد صاحب پریشانی سے بولے تھے نرس نے رضیہ کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔

"مسٹر! بلڈ چیک کرنے میں تاخیر نہ کرے گا آپ میرا خون لے لیں! میرا بلڈ گروپ بی پازلیج ہے۔" نگرہ گیلائی نے کہا تھا "سمید کو جانی ہوئی ماں کو دیکھ کر ایک عجیب سا خیال گزرا تھا اور وہ اپنی سوچوں کو جھٹکتی نماز کے ارادے سے اٹھ گئی تھی۔

"بابے! اتم یہاں کیا کر رہی ہو۔۔۔؟" جانی پھپھائی آواز پر وہ چلی گئی سامنے ہی سارہ اور شرجیل کھڑے تھے "سمید نے سارہ سے گلے ملے ہوئے سمید کے ایکسینٹ کا بتایا تھا۔

"تم اپنے اسی کزن کی تو بات نہیں کر رہی جس کی تم سے اور تمہارے پاپا جانی سے کافی مشابہت ہے۔" سارہ کے پوچھنے پر اس نے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

"سارہ! میں تو اسے رامیہ بھائی کا بھائی ہی سمجھتا تھا۔" سارہ کے بتانے پر وہ حیرانگی سے بولا تھا۔ شرجیل کی سمید سے دقیق آئن اور رامیہ کی مکئی میں ملاقات ہوئی تھی "سمید جو پہلے ہی ابھی ہوئی تھی اسکی اکھن مزید بڑھ گئی تھی اور اس نے سمید اور نہ دیکھ کر ان سے اجازت لی تھی۔

"یہاں سمید کو ڈوش آ گیا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

سمید کے بتانے پر اس نے رب کا شکر ادا کیا تھا۔

"یہاں ممانی جان کہہ رہی ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ گھر چلی جائیں کیونکہ مجھے تو کچھ بتانا آتا نہیں ہے اس لئے آپ سمید کے لئے پرہیزی کھانا بنالیں گی! سمید تو ایسے بھی کھانے میں بہت مین سٹخ نکالنے کا مادی ہے۔" سمید نے اسے نگرہ گیلائی کا پیغام دیا تھا اور وہ ان دونوں کے ساتھ "جشید کا بیچ" چلی آئی تھی۔

اس نے رات کا کھانا بنایا تھا سمید کے لئے سوپ بنا کر لٹن میں رکھا تھا اور سمید کو بنانے کے ارادے سے کچن سے نکلی تھی رضیہ بانو کے کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ مکئی ہوئی الماری پر پڑی تھی اور وہ بند کرنے کے ارادے سے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ماموں الماری بلکہ لاکر بھی کھلا ہوا تھا اس نے بند کرنا چاہا تھا مگر لاکر میں رکھے چوڑی بکس کی ترتیب خراب ہونے کی وجہ سے بند نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے انہیں ترتیب دیا تھا اور جیسے اس کی نگاہ چند پیرز پر پڑی تھی جو سڑے تھے ہو رہے تھے اس نے سمید حاکر کے رکنا چاہا تھا جیسے اس کی نگاہ ٹھک گئی تھی اور وہ پیرز پڑھنے لگی تھی۔

"یہاں اس طرح یہاں کیوں کھڑی ہو؟" کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زبیر نے پوچھا تھا اور اس نے ہاتھ میں موجود پیرز اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیئے تھے۔

"یہاں ان پیرز میں ایسا کیا ہے کہ تم رو رہی ہو۔" پیرز ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا تھا اور جیسے ہی نگاہ تحریر پر پھنسی تھی زبان حیرت سے گنگ رہ گئی تھی۔

"زبیر! پھپھو ایسا کیسے کر سکتی ہیں؟" وہ روتے ہوئے بے یقینی سے کہہ رہی تھی جبکہ وہ کیا جواب دیتا اس کی تو خود عقل دھبہ رہ گئی تھی۔ اسے اپنی ماں سے کم از کم ایسی امید تھی مگر ہاتھ میں موجود پچائی ایسی تھی کہ جھٹلائی نہیں جاسکتی تھی۔ وہ بیا سے نگاہ چراتاروم سے نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

جشید کا بیچ میں اس وقت احمد صاحب اور نبیل گیلائی کی پوری فیملی موجود تھی چائے کا دور چل رہا تھا اور ایسے میں سمید کی نگاہیں بھی نبیل گیلائی تو بھی سمید کے چہرے کا طواف کرنے لگتیں زبیر اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس وقت اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔

"یہاں میرے سینگ نکل آئے ہیں جو آپ کب سے مجھے ہی گھورے جا رہی ہیں۔" جہاں بابی لوگ متوجہ ہوئے تھے سمید کی بات پر سمید گڑبڑا گئی تھی "سنجھتے ہوئے اس نے آج ہی حقیقت پر سے پردہ ہٹانے کا سوچا تھا اور مسکرا کر بولی تھی۔

"میں دیکھ رہی تھی سمید! کہ تم پاپا جانی سے کتنے ملتے ہو! احمد نکل سے۔"

"اپنے ماموں اسے ہی تو ملتا ہے اس میں اتنی۔"

"پھپھو! بس کر دیتے اور کب تک اپنے جھوٹ کو سات پردوں میں چھپاتی رہیں گی۔" سمید جی سے ان کی بات کاٹ گئی تھی۔

"یہاں دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا میں نے کونسا جھوٹ۔۔۔" رضیہ بانو نے اپنی گڑبڑاہٹ غصہ میں چھپائی چاہی تھی مگر وہ چیخ پڑی تھی۔

"پھپھو! آپ پوچھتی ہیں کون سا جھوٹ آپ کا جھوٹ تو یہ سامنے بیٹھا ہے۔" اس نے سمید کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا تھا جبکہ باقی سب حیرانگی سے اسے دیکھنے لگے تھے۔

"یہ سمید احمد! سمید احمد نہیں! یہ تو سمید نبیل گیلائی ہے۔" اس نے دھماکہ کیا تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔؟" احمد صاحب اور نبیل گیلائی بیک وقت حیرانگی سے کہہ اٹھے تھے۔

"میں نے ابھی جو کچھ کہا وہ ایک ایسا بیج ہے جسے پھپھو 22 برسوں سے جھوٹ کی چادر میں چھپائی آئی

ہیں 'سمید' آپ کا نہیں احمد انکل پنا جانی کا بیٹا ہے اور ایسا سمید کے چہرے اور آنکھوں میں صاف لکھا تھا لیکن جسے پہچو اور رادی ماں ہمیشہ رشتوں کی آڑ میں چھپانی آئی ہیں اور اگر آپ لوگوں کو مجھ پر یقین نہیں تو زہیر سے پوچھ لیں اس نے بھی وہ برتھ سٹولٹ دیکھا تھا اور پہچو نہیں تو جھٹا سکتی ہیں مگر برتھ سٹولٹ کو نہیں...."

وہ بہت دکھ سے کہتی چپ ہو گئی تھی سب کی نگاہیں رضیہ بانو پر تھیں صرف ایک نجمہ گیلانی تھیں جو پرسکون انداز میں سونے پر بیٹھی تھیں۔

"بیانے جو کہادہ سچ ہے 'سمید' کو میں نے نہیں 'نجمہ' نے جنم دیا۔" وہ شرمندگی سے بولی تھیں احمد صاحب کا ہاتھ اٹھا تھا اور رضیہ بانو کے گال پر ثبت ہو گیا تھا۔

"اتھ بیٹے اس میں رضو کا کوئی تصور نہیں ہے۔"

نفیسہ بانو آگے بڑھ کر بیٹی کی ڈھال بن گئی تھیں لہجہ بھر کو کمرے میں سکوت سا چھا گیا تھا جس میں رضیہ بانو کی سسکیاں گونج رہی تھیں اور اسی میں نفیسہ بانو کی آواز ابھری تھی۔

"رضیہ اور نجمہ کی ذلیوری ایک ہی دن اور ایک ہی ہسپتال میں ہوئی تھی رضیہ نے مردہ بچے کو جبکہ نجمہ نے وہ جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا 'دونوں ہی بے ہوش تھیں جس کا فائدہ اٹھا کر میں نے نجمہ کے بیٹے کو رضیہ کے اور رضیہ کے مردہ بچے کو اور نجمہ کی بیٹی کو اس کے پہاؤ میں لٹا دیا تھا۔" نیل گیلانی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ماں کو دیکھ رہے تھے۔

"رضیہ کو جب پتہ چلا تو اس نے نجمہ کو اس کا بچہ لوٹانے کو کہا تھا مگر میں نے اسے خاموش رہنے کو کہا۔"

"مگر ماں! آپ نے ایسا کیوں کیا....؟" نیل گیلانی کے لب بھٹک رہے تھے۔

"میں نے ایسا نفرت کے دھارے میں بیٹے ہوئے کیا میں نے بدلے کی آگ میں جتے ہوئے ایسا کیا 'نجمہ' نے مجھ سے میرا بیٹا چھینا تھا اور میں اس سے ہر ایک محبت چھین لیتا چاہتی تھی۔" وہ ہر ایک جذبے سے

عادی لہجے میں بول رہی تھیں۔

"اماں! یہ آپ کی کیسی نفرت تھی جس میں آپ نے اپنے ہی بیٹے کے وجود کو خاکستر کر دیا مجھے بے وارث کرتے اپنے وارث کا خیال آپ کے دل میں...."

"تو میرا بیٹا نہیں ہے میں نے تجھے جنم نہیں دیا۔"

وہ ایک جھٹکے سے ان سے فاصلے پر ہوئے تھے جبکہ وہ ایک نظر نیل گیلانی کے چہرے پر ڈالتیں ماضی کے اوراق پلٹنے لگی تھیں۔

"میں اپنے والدین کی انگوٹی اولاد تھی میرے والدین مجھے بہت چاہتے تھے زندگی کی ہر آسائش مجھے میسر تھی میں نے بچپن ہی سے ماں باپ خاندان اور اسکول میں بھی توجہ و محبت سمیٹی تھی اور سب کے بے جا لاف پیار نے مجھے کافی ضدی اور خود سر بنا دیا تھا جو چیز ایک دفعہ مجھے بھا جائے اسے حاصل کئے بنا نہیں رہتی تھی میری صرف ایک ہی دوست سملی تھی بچپن سے میرا اور اس کا ساتھ تھا سملی ایک معمولی شکل و صورت کی نامی لڑکی تھی جبکہ میں حسن و جمال میں یکساں تھی 'کانٹ' میں کتنے ہی لڑکے مجھ پر مرتے تھے مگر میں کسی کو گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی اور جب میں سیکنڈ ایئر میں تھی ہمارے کانٹ میں نئے پروفیسر آئے تھے اسد خان کانٹ چند سم تھے مجھے ان سے محبت ہو گئی تھی لیکن اسد خان کا نظر انتہا سملی پر جا ٹھہرا اور جس شخص کے سینے میں نے اپنی آنکھوں میں سمائے تھے سملی اس کی دلہن بن گئی اور مجھے سملی سے نفرت ہو گئی وہ بچ میں نہ ہوتی تو اسد خان صرف میرے ہوتے مگر میں سملی یا اسد خان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی سملی کی شادی کے 6 ماہ بعد ہی میری شادی شہر کے مشہور صنعت کار کے انکوتے بیٹے سے ہو گئی پیسے کی کمی تو مجھے میکے میں بھی نہ تھی اور اب تو دولت کی ریل پیل تھی میں نے شوہر کے اثر و رسوخ کو استعمال میں لاتے ہوئے اسد خان کی جا ب کرا دی اور سملی ایک دن مجھ سے اس سب کی

پوچھنے آئی تھی اور غفار نے ہماری باتیں سن لیں اور غفار جو مجھ پر جان چمکتے تھے وہ مجھ سے بدگمان ہو گئے کیونکہ انہیں یہ بات گوارا نہ تھی کہ ان کی بیوی کسی اور سے محبت کرتی تھی ان کا رویہ میرے ساتھ ایک دفعہ جو برا ہوا وہ رضیہ کی آمد کے بعد بھی درست نہ ہوا غفار کو میرے ساتھ بیٹی کی بھی پروا نہ تھی کبھی غفار نے بیٹی کو گود میں لے کر پیار نہیں کیا تھا اور رضیہ آٹھ برس کی ہو گئی تھی۔ زندگی اسی طور پر گزر رہی تھی میں لڑکر میکے چلی جاتی اور پھر لوٹ آتی لیکن ایک حادثہ میں غفار کی زندگی ختم ہو گئی اور جس کار کے ذریعے ہوئی تھی اسے اسد خان ذرا رنجور بنا دیا تھا غفار کے والد نے اسد خان پر کیس کر دیا تھا مگر غلطی غفار کی تھی اس نے ڈرنک کی ہوئی تھی اس لئے عدالت نے اسد خان کو بری کر دیا میں عدت میں تھی جب ایک عورت ڈھانکی سال کے بچے کو اٹھائے مجھ سے ملنے چلی آئی اور اس نے جو کچھ مجھے بتایا وہ میری نو سالہ شادی شدہ زندگی کو تہہ و بالا کر گیا اس عورت کا تعلق کوٹھ سے تھا اور اسے غفار نے شادی کی تھی اور حقیقت نکاح نامے اور برتھ سٹولٹ کی صورت میرے سامنے پڑی تھی اس عورت کو کینسر تھا اور وہ چاہتی تھی کہ میں اس بچے کو رکھ لوں میں نے اس عورت کو دھتکار کے بھیج دیا تو وہ میرے ساس سر کے پاس پہنچ گئی اور غفار کے والد نے وہ بچہ اس عورت سے لے لیا کیونکہ اب اسی کے ذریعے لن کا نام آگے بڑھ سکتا تھا میرے ساس سر نے مجھے اپنے گھر سے نہیں نکالا تھا مگر اب ان کی مرضی تھی کہ میں اس بچے کو اپناؤں اور نہ اس گھر سے میرا کوئی تعلق نہ ہوگا میرے جیڑش آئے پیچھے چل بسے تھے اور غفار کا گھر ہی میرا ٹھکانہ تھا میں نے غفار کے والد کی شرط مان لی میں جب رضیہ کو پیار کرتی تھی تو بڑی حیرت سے مجھے ملتا کرتا تھا اور اس میں غفار کی شہادت بھی بہت تھی میری بیٹی محبت اسد خان تھا مگر جب میرا نکاح غفار سے ہوا تو میں نے تن من سے

اسے اپنا شوہر مان لیا تھا اور اب میں نے غفار کے بیٹے کو ماں کا پیار دینے کا خود سے بہہ کیا اور رضیہ کی طرح نیل کا بھی خیال رکھنے لگی مگر اکثر ایسا ہوتا کہ نیل کو دیکھ مجھے غفار کی بے وفائی یاد آتی اور میں اسے خود سے دور کر دیتی وقت بیکھ آگے بڑھا میں نے رضیہ کی شادی کر دی اور نیل کے لئے ایک لڑکی پسند کر لی لیکن نیل جو میری ہر بات کو حکم کا درجہ دے کر مانا کرتا تھا اس نے صاف انکار کر دیا اور جس لڑکی کا اس نے نام لیا تھا وہ اسد خان اور سملی کی بیٹی تھی اور میں کسی بھی قیمت پر نجمہ کو بڑھ نہیں بتانا چاہتی تھی۔ نیل کی ضد بڑھی تو میں نے اسے دودھ نہ پینے اپنی جان لینے کی دھمکی دی اور مجھے یقین تھا کہ اب نیل دوبارہ نجمہ کا نام نہیں لے گا مگر میرا یقین ٹوٹ گیا سملی نے میری محبت چھینی میرے شوہر کو مجھ سے متنفر کر دیا اور اس کی بیٹی نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا نیل نے نجمہ سے نکاح کر لیا تھا اور یہ نکاح اسد خان اور سملی کی ایماء پر ہوا تھا جب نیل نجمہ کو لیکر آیا تو میں نے اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا مگر یہ میرے قدموں میں بیٹھ گیا اور میں اس کی آنکھ میں آنسو نہ دیکھ سکی اور نجمہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اس وقت میرے دل میں نفرت کا شائبہ تک نہ تھا میں یہ بھول گئی تھی کہ نجمہ میرے دشمنوں کی بیٹی ہے مجھے صرف اپنے بیٹے کی خوشی عزیز تھی لیکن جب رات میں مجھے تنہائی میسر آئی میں نے اپنی زندگی کا محاسبہ کیا تو مجھے سوائے خسارے کے کچھ نظر نہ آیا نہ مجھے محبت ملی نہ شوہر کا ساتھ اور بیٹا بھی اپنی ہی من مانی کر کے رہا میرے دل میں اس کے سر پر سہا سجانے کا ارادہ ہی رہ گیا غفار سے نباہ کرنے کی میں نے بہت کوشش کی تھی مگر وہ صرف یہ جان کر کہ میں نے بھی اسد خان سے یکطرفہ محبت کی تھی مجھ سے متنفر ہو گیا اور میں نے اس کی بے وفائی کو سینے سے اٹھا کر پا لیا لیکن بیٹے نے بھی باپ کی طرح مجھے ایک عورت کی خاطر ٹھکرادیا اور بس وہی دن میری ماما کا آخری دن تھا۔

نہ کے سامنے میں نجمہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتی اور اس کے پیچھے جتنا حرام کئے رکھتی کیونکہ اس کی ماں باپ اور یہ خود مجھے اپنی مجرم گنتی تھی جیسے میری بیٹی رضیہ کو باپ کا پیارا نصیب نہیں ہوا تھا میں نے سلطی کی نو اسیدوں کو بھی باپ کی شفقت سے محروم کر دیا لیکن میں سمید کو رضیہ کو نہیں دینا چاہتی تھی یہ غلطی نرس سے ہوئی تھی کہ اس نے رضیہ کا مردہ بچہ نجمہ کے پہلو میں لٹا دیا تھا اور ایک کنوڑ لے کر زمین آ کر میں نے اس غلطی کو دور نہ کیا اور کسی کو شک بھی نہ ہوا کہ سمید رضیہ کا بیٹا نہیں ہے اس کی شکل کی وجہ سے اکثر لوگ اسے ٹیل کا بیٹا سمجھتے تھے لیکن ماموں کا من کر بھی مطمئن ہو جاتے تھے میں نے جو کچھ کیا وہ اپنی محرومیوں کا بدلہ لینے کے لئے کیا۔ آگے کچھ بھی کہنے کی ان میں ہمت نہ تھی اور ٹیل گیلانی سکتہ قدموں سے چلتے ماں کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔

”اماں! جس حقیقت سے آپ نے مجھے آج روشناس کر دیا ہے اسے میں کیسے تسلیم کروں۔ وہ عورت جس نے اپنی تمام کرشمے چلنا سکھایا جسے میں بچپن سے ماں کہتا آیا ہوں جس نے مجھے محبت کرنا سکھایا آج وہ مجھ سے محبت کرنے کی سہ چھین کر کہتی ہے کہ وہ میری ماں نہیں ہے اس نے مجھے پیدا نہیں کیا۔ ماں میں اس ماں کو نہیں جانتا جو مجھے اس دنیا میں لانے کا سبب تھی میں تو اس کو ماں جانتا ہوں جس کے دم سے میری حیات کو دوام ہے اور جب ماں! خدا نے نہیں کہا کہ جنت کی سوتلی یا پالنے والی ماں میں ہے صرف سنی جنم دینے والی ماں کے قدموں تلے ہے تو آپ نے کیوں آج مجھے یہ کہہ کر میری جنت سے دور کر دیا کہ آپ میری ماں نہیں ہیں۔“ وہ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے ہستی آنکھوں سے آنسو دیکھتے ہوئے بول رہے تھے جبکہ ان کے پاس اپنی منگائی میں یا ان کی بات کا جواب دینے کے لئے الفاظ ہی نہیں تھے اور وہ جیسکے سے کھڑے ہوتے ہوئے بال منہیں

میں جکڑے چپے تھے۔

”ماں! میں کیسے یقین کروں کہ مجھے نفرت کی راہ پر ڈالنے والی میری ماں تھی مجھے میری بیوی سے جھگڑے پر اکسانے والی میری ماں تھی مجھے میری بچیوں سے دور کرنے والی میری ماں تھی بیٹوں سے نفرت پر اکسانے وارث کی چاد میرے دل میں پیدا کرنے والی میری ماں تھی میرے وارث کو مجھ سے جدا کر کے مجھے بے وارث کرنے والی میری ماں تھی بتائیے ماں کیسے مانوں کہ وہ آپ نہیں جس نے میری زندگی سے خوشیاں چھین کر مجھ سے نفرتوں کے درخت اکوڑے۔“ نیل گیلانی ایک کرب سے ان کو کاندھے سے تھام کر دوزخوں بیٹھ گئے تھے قطرہ قطرہ سوتی ان کی آنکھوں میں سے ٹپک رہے تھے۔

”اماں! میں نے تو نجمہ کو یہ سوچ کر اپنایا تھا کہ آپ مجھے بہت چاہتی ہیں میری خوشی کی خاطر نجمہ کو اپنا لیں گی اور جس بل آپ نے نجمہ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا ایک بیٹے کا یقین جیت گیا تھا میں نے نجمہ سے کہا کہ وہ میری ماں کی عزت کرے اور میں نے اسے اس کی ماں سے دور کر دیا مجھے کہیں آپ غلط لگتی ہی نہیں تھیں جو آپ نے کہہ دیا بس وہ ہی سچا تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ میری بیوی بد زبان ہو سکتی ہے میری بیٹیاں نفرت کے قائل ہو سکتی ہیں مگر میری ماں! وہ کبھی غلط نہ ہوئی تھیں سکتیں میری ماں میرا برا کبھی چاہی نہیں سکتیں مگر آج میرا یقین پاش پاش ہو گیا کیوں ماں کیوں۔ ہوا ایسا؟ آپ کو کب لگا کہ میں آپ کی حکم ندولی کروں گا۔“ وہ ان کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوال کر رہے تھے جس کا جواب وہ دے نہیں سکی تھیں۔

”اس وقت آپ کا اعتماد مجھ پر سے اٹھ گیا تھا ناں جب میں نجمہ کو بیاہ کر گھرا لیا تھا تو اس اسی وقت کہنا تھا کہ بیٹا! بیوی یا ماں میں سے کسی ایک کو جن لو خدا کی قسم ماں میں جنت کی خاطر محبت کو چھوڑ دیتا اور جس عورت کو

صرف آپ کی خوشنودی کی خاطر 24 برسوں سے اذیت دیتا آرہا ہوں اسے اپنی زندگی سے بے دخل کرنے میں مجھے کتنے لمحے لگتے۔“ میں آپ کی خاطر نجمہ کو چھوڑ دیتا آپ کو میری بیٹی ناپسند تھی ایک دانہ کہتیں خود اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیتا اور ماں میں جس بیٹی کو صرف آپ کی جان کی خاطر ابارل شخص سے بیاہ سکتا ہوں تو آپ کی خاطر اسے مارنے میں مجھے کیا قتال ہوتا۔“ آپ ایک بار مجھے کہتیں تو میں خود اپنا بیٹا جس کی جھولی میں آپ چاہتیں ڈال دیتا میری تو تمام زندگی آپ کی فرما ہر درپوں کی نظر ہو گئی اور آج آپ کہتی ہیں کہ آپ میری ماں نہیں ہیں۔ میں آپ کے شوہر کی بے وفائی کا ثبوت ہوں ماں! میں نے ہمیشہ ایک بیٹے کے جود قائم کیا اس کا کیا۔“ آپ نے میرے سر سے مست کی چھانچھان چھین کر مجھے میری جنت سے دور کر دیا صرف ایک غلطی کی محبت کی شادی کی مگر آپ کی خاطر اسی محبت کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا یہ عورت۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر نجمہ کو بازو سے تھام کر ان کے آگے کیا تھا کتنی حسرت سے مجھے دیکھتی تھی لیکن میں اسے آپ کے حوالے کر کے بھول گیا وفا نہیں نبھائی صرف ماں کی خاطر باپ نہیں بن سکا صرف ماں کی خاطر اچھا شوہر نہیں بن سکا ماں کی خاطر میں مرنا باپ شوہر محبوب کچھ بھی نہیں بن سکا صرف ایک اچھا بیٹا بننے کی خاطر اور آج آپ نے کہہ دیا کہ میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں آپ میری ماں۔“ انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”بیٹا جانی!“ وہ تینوں لپک کر ان تک آئی تھیں۔

”دور! دور! مجھ سے بہت دور جب تمہیں سہارے کی ضرورت تھی میں نے دیا تم کو سہارا نہیں نہیں دیا۔ تم بھی مجھے بے سہارا چھوڑ دو۔“ انہوں نے ان تینوں کو خود سے دور کیا تھا ان کا چہرہ خطرناک حد تک سفید پڑنے لگا تھا۔

”میں نے تمہارے ساتھ کسی کے ساتھ اپنے ساتھ بھی وفا نہیں نبھائی صرف ماں کی خاطر اور آج میری ماں کہتی ہے کہ میں اس کا بیٹا نہیں ہوں۔“ درو کے آٹھ ان کے چہرے پر چھانے لگے تھے۔

”زہیر! ڈاکٹر کو بلاؤ بیٹا جانی۔“ سمجھ چیتے ہوئے ان کے بازو کو تھام گئی تھی۔

”ماں! جنم دینے والی ہی نہیں پالنے والی بھی تو ماں ہی ہوتی ہے پھر ماں آپ کیوں کہتی ہیں کہ میں آپ کا بیٹا نہیں۔“ وہ بازو چھڑاتے ایک بار پھر ماں کی جانب بڑھے تھے اور سینے پر ہاتھ رکھے ماں کے قدموں میں ڈھیر ہو گئے تھے ان کے گرتے ہی کتنی ہی چٹیں بلند ہوئی تھیں۔ زہیر نے ایسولینس منگوائی تھی اور ٹیل گیلانی کو لئے وہ باہر دوڑے تھے جھشید کالج میں اس وقت سمید (جس کی ٹانگ پر پلستر چڑھا ہوا تھا) رضیہ بانو جن کا ہاتھ تمام کر احمد صاحب نے روکا تھا جبکہ رضیہ بانو کے قدم تو جیسے جکڑے گئے تھے۔

..... ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”رضیہ بیگم! جس شخص کو یہاں سے لے گئے ہیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہے تو کیوں جا رہی ہو۔“ کیا کوئی نیاز ختم لگانے کا ارادہ ہے۔ احمد صاحب کی زبان زہرا گل بدی تھی۔

”احمد۔“

”رضیہ بیگم! اب کون سی چالی کو جھوٹ کا چہرہ بن دھانا کرنے کی خواہش ہے۔“ انہیں لب کھولتے دیکھ طنز یہ لہجہ میں بولے تھے۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا رضیہ کہ تم ایک ماں ہو کر دوسری ماں سے اس کا لخت جگر چھین لو گی اور کونسا شخص جس وارث کی ضرورت تھی؟ خدا نے تمہیں 2 بیٹوں سے نوازا تھا اس کے باوجود تم نے نجمہ بھابی کی گود سونپی کر دی سمید کی ولدیت کے خانے میں میرا نام لکھوا کر مجھے بھی مجرم بنادیا تمہیں کوئی کتبے ایک دانہ بھی تمہیں تمہارے نمبر نے ملامت نہ کی تمہاری کرنی

— ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ —

”اماں! آج پورے گیارہ دن بعد اس نے ماں کو پکارا تھا اور وہ بیٹے کے چہرے سے تکیں پاک انہی تھیں۔“

1994 ★★★★★ 1995

”یہ ابو جان کی کیسی محبت ہے، جس شخص نے انہیں محبت کے حسین خواب دکھ کر محبت کی آقا نہ رکھی و غناؤں کے بدلے غم ہی غم دیئے یہ انہیں آج بھی اتنا ہی چاہتی ہیں ان کی یہ کیسی محبت تھی جس نے محبوب کا ناروا سلوک و ستم اس کرسنے کی قوت عطا کی اور یہ کیسا یقین ان کی محبت نے عطا کیا ہے کہ ڈاکٹرز کے مایوس ہو جانے کے بعد بھی یقین ہے کہ اللہ کے عیوب شوہر کو کچھ نہیں ہوگا ؟ یہ محبت بھی انسان کو کبھی کتنا کم طرف تو بھی کتنا اسی طرف بلا دیتی ہے اور بڑی سے بڑی خطا محلوں میں بخش دیتی ہے۔“ - سیکھ نہ آنگھوں سے ماں

”طلاق دیتا ہوں خلاق خلاق
سیر کی کوئی بات و فرماؤ گویا انہوں نے سنی ہی نہ تھی اور۔۔۔“

”تمہارا گھونگھٹ اٹھانے کے ساتھ ہی میں نے تم سے کوئی مہد و چپاں نہیں باندھے تھے فقط ایک بات کہی تھی تمہیں اپنا پابند نہیں بنانا تھا تمہیں ہر جائز اور ناجائز آزادی دی اور جس کے بدلے میں تم سے صرف ایک سچائی کا تقاضہ کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ وضہ دیناں بیوی ایک دوسرے کی پہچان ہوتے ہیں اور میری پہچان تھوٹی نہیں بولی چاہئے زندگی کا سفر اب ہم نے ساتھ گزارنا ہے اور زندگی میں کئی سوز ایسے آئیں گے جہاں ہم مل کر ایک اکیسے بھی فیصلہ لیں گے اور جو فیصلہ تم تجھ لو اس میں مجھے بعد میں شریک کرنا چاہو تو صرف تج کی بنیاد پر کیونکہ میں جریدی سے بڑی خانی اور خوبلی برداشت کر سکتا ہوں لیکن جھوٹ اور آدمی اور عورت

بچوں کی زندگی تباہ کرنے والی میں تھی میں نے تجھ سے تیری محبت چھینی، جیسا میرے فکروں کی نذر ہو گیا اور دیکھ آج میں دوسروں کو اجازتے اجازتے خود ہی اجڑا گئی اس گھر سے میرا تعلق ختم ہو گیا، زہیر! تمہارے بابا نے مجھے طلاق.... " وہ حقیقت بے کوئیمن بنا سکی تھیں لیوں پر جیسے قتل پڑ گئے تھے اور آنکھوں میں شرمندگی اور آئی تھی۔

"اماں! آپ کا تعلق اس گھر سے احمد قریشی سے ختم ہوا ہے لیکن مجھ سے نہیں، 3 لفظ میاں بیوی کے رشتے کو ختم کر سکتے ہیں لیکن ایسے لفظ بنے ہی نہیں جو ماں بیٹے کے رشتے کو ختم کر سکیں۔" اس نے سارے دکھ اپنے اندر دفن کرتے ہوئے ماں کے آنسو صاف کئے تھے مگر وہ بری طرح رونے لگی تھیں۔

"میں جو دوسروں کو مات دیا کرتی تھی آج ایسی مات کھاٹی ہے کہ خود سے اور اپنے بچوں سے نفرت ماننے کے بھی قابل...."

"اماں! ایسے نہ کہیں! آپ نے گناہ کیا تھا، ایک ماں سے اس کا بیٹا جیننا بہت بڑا گناہ ہے لیکن جو گناہ بابا جان نے کیا ہے وہ آپ کے گناہ سے کئی گنا بڑا ہے بابا جان نے اپنا حق للہ استمال کیا ہے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں کو کیسے دلا سہ دے اور خود کو اس بھیا تک حقیقت کو تسلیم کرنے پر کیسے مجبور کرے وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں بد زبان تھی مگر اس لائق نہ تھی کہ اس عمر میں یہ سب سہتا خطاب سے ہوتی ہے ان سے بھی ہو گئی تھی مگر احمد صاحب نے جو کیا وہ بالکل غلط تھا کیونکہ وہ ان کی نہیں نچہ اور ٹھیل گیلانی کی مجرم تھیں اور سزا انہوں نے بڑی کڑی دے دی تھی۔

..... ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ..

"بابا جان! آپ کہیں جا رہے ہیں۔" زہیر ہاتھ لپیٹتا تھا جب احمد صاحب نے ارجنٹ کال کر کے اسے بلایا تھا اور اب وہ صوفے کے پاس رکھے

سفری بیگ کو دیکھ سب سے پہلے بھی پوچھ بیٹھا تھا۔ "زہیر! میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں کیونکہ اس گھر پر میرا نہیں تمہاری ماں کا زیادہ حق ہے۔" وہ بیٹے کو بیٹھنے کا کہہ کر بولے تھے جبکہ وہ حیرانگی سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

"زہیر بیٹا! زندگی بہت سہل ہوتی ہے ہم خود ہی اسے سنبھالنا دیتے ہیں یہ گھر جو کل تک خوشیوں کا گہوارہ تھا میں نے اسے اجازت دیا غصہ میں نے رضیہ اور اپنا رشتہ ہی ختم نہیں کیا اپنے آشیانہ کو بھی خود ہی نذر آتش کر دیا اس خالی مکان کو میں نے اور رضیہ نے مل کر سچایا تھا اور جب تک ہم ساتھ تھے ہم دونوں کا برابر کا حق تھا مگر اب میں نے یہ گھر رضیہ کے نام کر دیا ہے کیونکہ وہ عورت جس نے 26 سال میرے ساتھ وفا بھائی اور میں نے ایک جھوٹ کے سبب اسے اپنی زندگی سے نکال دیا اس کے جھوٹ نے میرا مان میرا بھروسہ توڑا تھا مگر وہ اتنی بڑی سزا کی مستحق نہ تھی لیکن۔۔۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا اس لئے میں یہاں سے جا رہا ہوں تاکہ تمہاری ماں اس گھر میں واپس آ سکے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اس عمر میں لوگ اس پر انگلی اٹھائیں یا میری بیٹی سید کی شادی پر میرے فعل کا اثر پڑے۔" وہ ڈیڑھ دن میں ہی کافی غد حال سے نظر آنے لگے تھے انہیں اپنی لفظی کاشدیت سے احساس تھا مگر اب اس کا مداوا ممکن نہیں تھا۔

"بابا جان! آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے میں اماں کو کرائے۔"

"بیٹا! جانتا ہوں تم اپنی ماں کو تنہا نہیں چھوڑو گے لیکن کرائے کے گھر میں تمہاری ماں نہیں رہیں گے مرد با اختیار ہوتا ہے میں کہیں بھی کیسے بھی رہ لوں گا دنیا کا سامنا بھی کر لوں گا لیکن تمہاری ماں اور بہن وہ دنیا کا سامنا نہیں کر پائے گی ابھی سید کی شادی کرنی ہے میرا ایک ٹالا اقدام اس کی زندگی نہ تباہ کر دے اس لئے چاہتا ہوں کہ کسی کو اس کی خبر ہی نہ ہو کیونکہ یہ میں

جانتا ہوں کہ رضیہ ایک وفا شعار بیوی بہترین ماں تھی میرے سارے بچوں کی اٹلی پرورش اور بہترین کردار سب اس کی مرہون منت ہیں میں نے اس عورت کے ساتھ 26 برس گزارے ہیں اس کے اٹلی کردار کی گواہی میں دیتا ہوں لیکن میرا ایک فعل جو مجھ سے سرزد ہوا وہ اس کی ہر ایک نیکی کو بہالے جائے گا اور میں ایسا نہیں چاہتا کاش.... کہ وہ 3 لفظ میں نے نہ کہے ہوتے تو آج.... " وہ شرمندگی سے سر دونوں ہاتھوں میں تھام گئے تھے وہ اپنے اقدام پر شرمندہ تھے اور اس کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔

"بابا...." وہ زمین پر دوڑا انوان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے بیٹھ گیا تھا۔

"زہیر بیٹا! میں نہ صرف تمہاری ماں کا بلکہ تم سب بہن بھائیوں کا بھی مجرم ہوں ہو سکے تو مجھے خوف کر دینا اور میرے جانے کے بعد سب کا خیال رکھنا۔" ایک آنسو زہیر کے ہاتھ کی پشت پر گرنا تھا اور وہ کھڑے ہو گئے تھے۔

"بابا.... پر آپ جائیں گے کہاں....؟" وہ نم آنکھوں سے باپ کے سامنے آیا تھا۔

"خدا کی کائنات بہت بڑی ہے کہیں نہ کہیں تو چلا ہی جاؤں گا اور تجھے فون کر کے اپنا ایڈریس دے دوں گا جاتے جاتے بیٹا میں تجھے ایک تلقین کرنا چاہتا ہوں زندگی میں کوئی بھی فیصلہ غصہ میں مت لینا اللہ تعالیٰ نے غصہ کو حرام قرار دیا ہے مگر ہم بندے ایک اتنی سی بات بھول جاتے ہیں اور ایسے فیصلہ کر بیٹھتے ہیں کہ ہماری پوری زندگی بچھتاوا بن جاتی ہے۔" وہ بیٹے کے کاندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہاں ٹکل گئے تھے اور وہ چاہ کر بھی باپ کو روک نہیں پایا تھا اور زمین پر بیٹھا روتا چلا گیا تھا احمد صاحب کا غصہ میں اٹھایا جانے والا ایک اقدام زندگی کی رعنائیاں لے کر جدائیاں عطا کر گیا تھا جنہیں دور کرنا اب ناممکن ہی تھا۔

..... ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ..

"پتا جانی! یہ سوپ پی لیں۔" آواز پر انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں، تسمیہ نے ٹرے رکھ کر انہیں بیٹھنے میں مدد دی تھی اور بیڈ پر ہی ٹک گئی تھی وہ بڑی خاموشی سے بیٹی کے ہاتھ سے سوپ پینے لگے تھے لیکن ان کی آنکھوں کی دلیرگی، رونے لگی تھی۔

"میں کتنا بد قسمت انسان ہوں خدا نے مجھے ٹیک بیوی اور 3 بیٹیاں عطا کیں اور میں نے جن کی قدر ہی نہ کی یہ سامنے بیٹھی میری بیٹی جس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو میں ٹھکراتا آیا ہوں آج میرے درد کا سامنا بنے ہوئے ہیں جب اسے میری ضرورت تھی میں نے اسے منحوس کہہ کر ٹھکرا دیا اور آج یہ میرا سہارا بنی ہوئی ہے میں کبھی...."

"پتا جانی! کیا سوچنے لگے؟" بیٹی کی آواز پر وہ خیال سے چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

"یہی ناکہ آپ کی چھٹی کب ہوگی تو بے فکر رہنے ڈاکٹر ز کہہ رہے تھے کہ آپ کی چھٹی ٹل ہو جائے گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی جبکہ وہ مسکرا بھی نہ سکے تھے اور انہوں نے آنکھیں موند لیں تھیں۔

"پتا جانی! سونے کی نہیں، دوری ابھی آپ نے دوائیں بھی کھائی ہیں۔" وہ بیٹاش لہجہ میں بولی تھی اور وہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گئے تھے اس کا انداز بے تکلف تھا جبکہ انہوں نے بیٹیوں سے بے تکلفی تو کیا کبھی ان کے سر پر ہاتھ بھی نہیں رکھا تھا۔

"میں اچھا! باپ نہیں بن سکا مگر میری بیٹیاں...." "کیا...." پتا جانی! کہاں کھو جاتے ہیں آپ....؟" اس نے ان کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا دیے تھے۔

"تھو تو میں رات ہی گیا تھا اور میں نے صرف اپنا وجود ہی نہیں محبت اور پدرانہ شفقت بھی کھو دی زندگی جذبوں کے بغیر ہی گزر...." تسمیہ نے تھیلی ان کے سامنے کی تھی اور انہوں نے گولیاں اٹھا کر دو گھونٹوں میں نگلی تھیں اور گلاس واپس کرتے ہوئے بخور اسے

رواۃ الحجۃ 204

ایک مرد بچے اور نمدہ کی کوسم دیا ہے کوسمے عین میں
 ردا انجست [۱]

پاس ہے اے مجھے میں سے پیدا ہو، سر پر کھڑا کران کی نور
[2] اپریل 2011ء

رواد انجسٹ 204 اپریل 2011ء

رضیہ باجی کا بھی جائزہ لیتی رہی تھی اور وہ سمید کا اتنا ہی خیال رکھتی تھی جتنا انہوں نے جنید کا رکھا تھا اور میں تسلیہ کار کرتی تھی اور میں نے سوچا کہ میں نے اپنا بیٹا کھو کر بھی نہیں کھویا کیونکہ ایک ماں کے لئے بیٹے کے ساتھ سے زیادہ اس کی زندگی حقیقی رکھتی ہے میرا بیٹا زندہ تھا یہ بات میرے لئے بہت اہم تھی میں اگر سب کو سچائی بتاتی تو میرا بیٹا مجھے مل جاتا لیکن ایک ماں کا مقام بیٹے کی نگاہ میں ڈگمگا جاتا اس لئے میں نے حقیقت جان کر بھی خاموشی اختیار کئے رکھی اور جب بھی منہ سے کچھ نہ کہا جب سمید کی شکل و صورت گم سب لوگ اسے ٹیل کا بیٹا سمجھتے تھے میرا بیٹا میرے سامنے تھا اسے میں نے کچھ مایوسی ایتنا دودھ پلایا تھا میرے لئے کافی تھا کبھی کبھی جب مجھے وارث نہ دینے کا طعنہ اور میری بیٹی کو منحوس کہا جاتا تو میرے قدم ڈگرگانے لگتے مگر اب میں اپنے بڑے ہوتے بیٹے کی شخصیت میں چار پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی اور اماں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ سمید کو مجھ سے دور رکھیں اس کے بعد بھی میں کمزور نہیں پڑی کیونکہ مجھے صرف اپنے بچوں کی خوشی عزیز تھی ولت پر لگا کر اڑانے بڑے ہو گئے اور مجھے اپنے فیصلے پر سمید کو دیکھ بھی پہچتاوا نہیں ہوتا تھا کیونکہ رضیہ باجی نے یہاں کم از کم مجھ سے نفرت نہیں نبھائی تھی اور سمید کو چاہت سے پال کر ایک اچھا انسان بنایا تھا اور جب سمید کا ایکسیڈنٹ ہوا اسے خون کی ضرورت تھی اور جب احمد بھائی نے رضیہ باجی کو خون دینے کو کہا تھا تو میں آگے بڑھی تھی کیونکہ ماں میں تھی اور میرا بیٹا جی اٹھا تھا ایک زندگی اسے میرے روبرو کی ایک بوند نے دی تھی اور دوسری زندگی میرے خون کی ایک بوند نے اور جب میری متانت فاصلے پر دکر بھی اس پر سہارا کئے ہوئے تھی تو مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ میرا بیٹا ہے کیونکہ مجھے اور میرے رب کو تو معلوم تھا اور اسی نے ہمیشہ میری مدد کی میں اپنے بیٹے سے اور دکر بھی دور نہ ہو سکی۔ ”

”معاف تو میں نے آپ کو اسی دن کر دیا تھا جب آپ نے سید کی خاطر زوہیر کو مارا تھا جبکہ زوہیر کی غلطی نہ تھی، مگر ہوتا ہے نہ کہ ماں اکثر چھوٹے بچے کی خاطر بڑے کے ساتھ صرف اسی سوچ کے ساتھ زیادتی کر جاتی ہے کہ چھوٹے بہن بھائی کا خیال رکھنا بڑے بہن بھائیوں کا فرض ہوتا ہے اور اس دن مجھے لگا تھا کہ آپ ایک اچھی ماں ہیں اور اسی دن تو میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں ایک ماں سے اس کا بیٹا جدا نہیں کروں گی اولاد کو کھونے کا دیکھ تو میں سہہ چکی تھی اور میں اسی کرب سے آپ کو نہیں گزارنا چاہتی تھی آپ نے میری مستاکا خوں کیا تھا، مگر میں ایسا نہیں کر سکتی تھی اور آپ کو بتانا چاہنا بیٹا بخوشی سوچ دیا تھا۔“ وہ ان کے ہاتھ تھامتہ روتے روتے کہہ رہی تھیں۔

”نہیں رضیہ جاتی! یہ میں نے کسی ستائش کے لئے نہیں اپنے بچوں کے مستقبل اور خوشی کے لئے کیا“ میرا بیٹا آپ کو ماں کہتا تھا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ اسے یہ پتہ چلے کہ اسے آپ نے چرا لیا تھا، میں ماں کے ایجنے کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اور میرا بیٹا آپ کے لئے کوئی غیر تو نہ تھا میں نے اسے پالا یا آپ نے بات تو ایک ہی ہے سمیدہ ماں کی نہیں پیمپو کی گود میں پروان چڑھا تھا اور یہ تو سمیدہ کی خوش نصیبی ہے کہ اسے دو ادگوں کی محبت اور دعا میں نصیب ہوئیں ایک پالنے والی ماں کی اور دوسری پیدا کرنے والی ماں کی اور جب بہتری ہر طریقے سے میرے بیٹے کی تھی تو میں کیسے وہ نہ کرتی جو کیا۔“ دو تہہ کے آنسو صاف کرتی اٹھ گئی تھیں، جہاں ان تینوں کے دل دنیا میں

”نیل! آپ کی چائے پڑے پڑے ٹینڈی ہو گئی ہے آپ کن خیالوں اور سوچوں میں گم ہیں۔“ ان کی نگاہ نجمہ کے چہرے پر ٹھہر گئی تھی وہ وضو کر کے آئی تھیں اور پانی کے ننھے ننھے قطرے ان کے مہنچ چہرے کو انوکھی جاذبیت سی عطا کر گئے تھے۔

”میں چائے گرم“

”نیل میں جو اتنے برس خاموش رہی اس کا سبب یہ تھا کہ میں آپ کو دگنی نہیں دیکھ سکتی تھی، میں نہیں چاہتی تھی کہ سامں بہو میں رس کشی ہو، کبھی ماں تو کبھی بیوی کا پلڑہ بھاری ہو جائے اور آپ کبھی ماں تو کبھی بیوی کی حمایت میں بولیں۔“ وہ شہر کو کچھ بولنے کی شش و پنج میں پالی، خود سے ہی انہیں موقع دے گئی تھی۔

”توازن“ ہر شے کی بنیاد ہوتا ہے اور میں توازن قائم نہ رکھ سکتا۔ ماں کی خوشی کی خاطر بیوی کو دکھوں کی کیمائی میں دھکیل گیا۔“ وہ انہیں ٹوک مجھے تنہے اور وہ خلاءوں میں گھورتے بات آگے بڑھا رہے تھے۔

"میں نے بچپن میں دادا دادی کی شفقت دیکھی تھی مگر اس سے محروم ہو گیا تھا" اور صرف ایک میری ماں تنہی جو میرے قریب تھی مجھے اپنی ماں بہت عزیز بھی تھا

نے اپنی ماں کی تنہا بیوی کی بھی نہیں کی تھی اور میری ماں بھی مجھے بہت چاہتی تھیں بے نیند سنی تک میں لٹ لٹ کر جاتا تھا جہاں میرے دوست اور کاہن فیروز میرا مذاق اڑاتے تھے میری نسبت پر بھی دھک کرتے تھے ظہیر افسن میرا بہت اچھا دوست تھا اور اس کا گھر واحد تھا جہاں میں ماں کے ہاتھ کے بنے کھانے کے علاوہ کھانا کھالیا کرتا تھا اور وہیں مجھے تم نظر آئی تھیں پہلی لگاؤ کی محبت کا میں شکار ہو گیا تھا لیکن میری ماں تم سے میری شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ماں کے ایک اقرار یا انکار کے بعد کچھ نہیں پوچھا کرتا تھا جو ماں نے کہا بس وہی درست ہے مگر میں نے یہاں سب پوچھا تھا ماں نے بتانے سے منع کر دیا تھا میں نے تم سے شادی کر لی مجھے یقین تھا کہ ماں مجھے معاف کر دیں گی لیکن ماں ایسا نہ کر سکیں میں جانتا تھا کہ ماں کا رویہ تمہارے ساتھ درست نہیں ہے میں نے تمہیں جھوٹی سنی دی لیکن ماں سے بات کی تھی لیکن "ا حیرت سے انہیں دیکھنے لگی تھی اسے اس بات کا ہرگز بھی علم نہ تھا۔

"میں انہیں سمجھا نہیں سکا تھا اور جب ماں نے کہا کہ مجھے بیوی بھی اور ماں جھوٹی لگتی ہے تو جیسے میرے پاس کچھ کہنے کو بچا ہی نہیں۔" وہ اسے دیکھنے لگے تھے۔ "پلیز۔" نیل! گزری باتیں نہ دہرائیں زندگی کو اسی طور پر گزرو۔

"زندگی تو جیسے بھی گزری گزر رہی لیکن ایک احساس ندامت اور شرمندگی۔"

"نیل! ایسے نہ کہیں میں آپ کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتی تھی ورنہ کئی سوڈا ایسے آئے تھے کہ میں غلط کو غلط ثابت کر سکتی تھی۔" وہ جلدی سے ان کی بات کاٹ کر کہنے لگی تھی۔

"نیل! مجھے امان سے کوئی شکایت نہیں ہے انہوں نے وہ کیا جو انہیں نھیک لگا شکایت تو مجھے آپ سے ہے کہ آپ نے مجھے تباہ کر دیا ماں کے خلاف نہ جاتے مگر بیوی کو بے سہارا تو نہ کرتے۔" کئی برسوں سے دل میں

پھلتے شکوے زبان پر آ گئے تھے۔ "میں تمہیں بے سہارا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر میرے اندر ایک خوف کنڈلی مارے بیٹھا تھا کہ میں نے اگر تمہارے حق میں آواز بلند کی اگر تمہارا ساتھ دیا تو ماں مجھ سے خفا ہو جائے گی اور تم نے تو خاموشی سے ایک ظلم برداشت کر لیا مگر ماں نہ کر پاتیں تمہارا خاموشی میں میں سکون تلاش کرتا تھا۔" انہوں نے اپنی گزری بات کی تھی۔

"آپ کو سکون کی ضرورت تھی مگر ایسے کب آپ کو سکون ملا۔؟" مجھے تباہ کر کے خود آپ بھی تو تباہ ہو گئے تھے۔ آنسو رخساروں پر بہنے لگے تھے۔

"نیل! میں آپ کے ہوتے ہوئے بھی آپ کی کسی کا شکار نہیں ہوا چلے گئے نیل! اور میں ان کا آخری دیدار نہ کر سکی امان کے لئے کتنا تڑپی اور آپ نے آ۔۔۔ بڑھ کر میرے آنسو نہ پونچھے مجھے میرے بیٹے کا قاتل قرار دیا کیسے کیسے نہ تڑپی صرف آپ کی چاہ میں اور چہ بھی تو نہیں مانگا تھا صرف ایک چاہت کے کیوں آپ اتنے سنگدل ہو گئے کہ مجھے آپ کے ہوتے ہوئے بھی آپ کی ضرورت تھی۔؟ غلطی گزری بھی تھی تو کیوں نہ آگے بڑھ کر مجھے اس کا احساس دلایا کیوں میرے؟ احساس سے بے پروا ہو گئے اور خود بھی تڑپتے رہے" مجھے بھی آنسوؤں کے حوالے۔

"خطا ہوئی ہے مجھ سے نیل! مجھے معاف کر دو ورنہ یہ نیل! گمانی تو کل بھی صرف تمہارا تھا اور آج بھی اس کے دل میں صرف تمہاری تصویر نقش ہے۔" انہوں نے جذباتوں سے چور لہجے میں کہا تھا اور وہ ان کے سینے لگی تھیں۔

"آئی لو نیل! میں ترس گئی تھی آپ کا نرم۔۔۔ سننے کو آپ نے بے سبب جو دوریاں بڑھائی تھیں انہیں مٹانے میں 22 برس لگا دیئے۔" وہ کہہ رہی تھی اور آواز بھک گئی تھی۔

"بے سبب نہیں اس جدائی میں ماں

نرا بھرواری کا نہیں میرے شک کا ہاتھ تھا چاہا تھا نہیں اور جب ماں نے چند ٹوٹوں کے ساتھ کہا کہ تم ظفر افسن سے میری غیر موجودگی میں ملتی رہی ہو مجھے یقین نہیں آیا تھا مگر کب تک مرد تھا ماں! جلد ہی شک کا شکار ہو گیا زندگی کے کئی سوڈا ایسے آئے کہ تمہاری بے گمانی کا یقین دلاتے گزر گئے مگر میں نے خاموشی اختیار کر رکھی اور جس کے سبب میں نے تم سے ہر وہ سلوک کیا اور وہ بتا کر تمہیں توڑنا نہیں چاہتا تھا تم جو 22 برس سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں یہ جان کر تو شاید بے سوت ہی مرجاتیں اس لئے مجھے چپ رہنا ہے یہ کبھی نہیں بتانا کہ میں نے گزردہ لہجے کی زد میں آ کر اپنی جائیداد اور وفا شعار بیوی پر شک کیا تھا اور میرا یہ ایسا گمانا ہے جس پر میں پشیمان ہوں مگر معافی طلب نہیں کر سکتا۔" نیل! گمانی اس کے سر میں انگلیاں چلاتے سوچ رہے تھے مرد اور عورت کی وفا میں یہی فرق ہوتا ہے کہ عورت بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتی ہے لیکن مرد وہ جرم بھی معاف نہیں کر پاتا جو عورت سے سرزد بھی نہیں ہوا ہوتا احمد قریشی جنہیں یقین تھا کہ ان کی بیوی میں کسی قسم کی برائی نہیں ہے لیکن ایک جھوٹ کی وجہ سے انہیں زندگی سے بے دخل کر دیا جبکہ نجمہ جنہوں نے شوہر کے ہوتے ہوئے بھی اس کے نہ ہونے کا دکھ جھیا اور اپنی تمام عمر دسویں کو بھی صرف چند لفظوں کے عوض معاف کر دیا شاید اس لئے بھی کہ عورت ہمیشہ سے مجبور ہوتی ہے ایک سائبان کی خواہش اسے ہر چھوٹے بڑے کپڑوں پر غبرادیتی ہے جبکہ مرد کل اختیارات کا غور اور اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ 3 لفظ جب چاہے مرنے کے جس دور میں بھی کہہ سکتا ہے اور عورت ان گھوٹوں کو سنتی کہ اس نے وہاں وہاں کپڑا مٹا کر کیا تھا صرف گھر بھانے کے لئے مگر ہر کپڑا مٹا کر آج فنا ہو گیا اور اس کی ہستی بھی۔۔۔

"درد جب حد سے بڑھا ضبط کے آنسو کیجئے ہم نے سیکھا ہی نہیں آئندہ سے رونا سائیں"

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وہی ہی گشتا ہٹ پر اس نے آنکھیں کھولی تھیں سامنے ہی زہیر کھڑا مسکرا رہا تھا وہ آج کل درست کرنی کھڑی ہو گئی تھی۔

"نیل! برتھ ڈے ہوا۔" وہ اس کے عین سامنے کھڑا زیر لب مسکرانے لگا تھا۔

"آئی تمہیں تم کچھ دیر پہلے مجھے سب کے ساتھ دس کپڑے دو۔" وہ چپل پہنتے ہوئے بولی تھی آج اس کی 23 سالوں میں فرسٹ برتھ ڈے تھی جو سیلبریت کی گئی تھی اور اس کے ساتھ سید کو بھی سب نے گفٹس دیئے تھے زہیر نے اسے رست راج اور سید کو بین دیا تھا۔

"یہ راعت ہوا ہٹ جو گفٹ میں نے سب کے سامنے دیا وہ میری مجبوری تھی جو گفٹ تمہیں میں دینا چاہتا ہوں اس کے لئے یہ مقام بالکل درست ہے۔" اس کے لہجے میں شرارت تھی اور وہ نا اہلی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"ہوا! اس جگہ سے تمہیں کچھ یاد نہیں آتا۔؟" اس کے شرارت سے پوچھنے پر اس نے نلی میں گردن باندی تھی۔

"ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ تمہیں کیا رہا گشت کی وہ شام یاد ہی نہ ہو جب میری بے اختیاری ہمیں محبت کروا گئی تھی۔" وہ اب اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور وہ اس لمحہ کو سوچتی حیات سے ہلکیں جھٹک گئی تھی۔

"ہوا! دل بھیری می۔۔۔؟" اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا زہیر کی نگاہ میں صرف اس کا ٹکس تھا۔

"نیل!۔۔۔" اس نے کہہ کر جانے کو قدم بڑھائے تھے مگر وہ اس کی نکالی تمام گیا تھا۔

"ہجہ جان سکتا ہوں؟" اسے اپنے مقابل کھڑا کرتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

"تم پہلے سے جانتے ہو۔" کہتے ہوئے ہاتھ جھڑاتا چاہتا تھا مگر وہ گرفت مضبوط کر گیا تھا۔

"ہوا! تمہاری ہر نفرت تو وقت کے دھارے میں

